قرآنِ حکیم کی قوتِ تسخیر

اظہارِ تشکر اور تحدیثِ نعمت
پر مشتمل ایک اہم خطاب

ڈاکٹر اسرار احمد

شائع کردہ :

تنظیمِ اسلامی

مرکزی دفتر: A-67علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور۔54000
فون: 36293939,36316638,36366638 فیکس: 36313131
ای میل: markaz@tanzeem.org www.tanzeem.org

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا سالانہ اجلاسِ عام 20/اپریل 1992ء کی شام کو منعقد ہوا اور اس سے قبل مسلسل چار دن تک تنظیم اسلامی کا سترہواں سالانہ اجتماع جاری رہا۔ یوں سمجھئے کہ تحریکِ قرآنی کے اس قافلے نے جو مرکزی انجمن خدام القرآن کے نام سے محوسفر ہے، اپنے زندگی کے بیس برس مکمل کر لئے۔ اسی طرح تنظیم اسلامی کی عمر بھی اب سترہ برس ہو گئی ہے۔ اس عرصے کے دوران جو خیر بھی بن آیا ظاہر بات ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق اور اس کی نصرت و اعانت [۱] کے طفیل ہوا، اس پر اس کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ احباب جانتے ہیں کہ گذشتہ ایک سال کے دوارن متعدد مواقع پر میں چند خاص حقائق کے حوالے سے بعض امور پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی شکر ادا کرتا رہا ہوں۔ آج پھر میں چاہتا ہوں کہ انہیں یکجا کر کے اور مرتب انداز میں آپ کے سامنے پیش کروں۔

تحریک میں تسلسل اور دوام —— ایک لائق شکر بات

سب سے پہلا شکر ہم پر اس اعتبار سے واجب ہے کہ ہمارے اس کام میں، جس کے یہ دو نمایاں تنظیمی مظہر [۲] ہیں، یعنی انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی، الحمدللہ کہ گذشتہ بیس برس سے تسلسل بھی ہے اور تواتر بھی۔ گو ہماری رفتار کوئی بہت زیادہ تیز نہیں رہی، لیکن اس میں جو تسلسل اور تواتر کا پہلو ہے وہ میرے نزدیک بہت اہمیت کا حامل ہے۔ طوفان کی طرح اٹھنے والی تحریکیں بسا اوقات بہت جلد جھاگ کی مانند بیٹھ بھی جاتی ہیں، لیکن جس کام میں تسلسل اور دوام ہو اور جو پیہم کیا جائے اصل میں وہی پائیدار بھی ہوتا ہے اور اسی کے نتیجے میں کوئی حقیقتاً مؤثر اور وقیع [۳] کام سرانجام پا سکتا ہے۔ میں نے حالیہ سالانہ اجتماع کے دوران بھی اس ضمن میں دو الفاظ ایک انگریزی محاورے کے حوالے سے استعمال کئے تھے:

---

(۱) مدد۔حمایت (۲) ظہور، ظاہر ہونے کی جگہ (۳) وُقعت رکھنے والا

(i)Slow (ii)Steady ۔ ہمارے اب تک کے کام پر یہ دونوں الفاظ منطبق[(۱)] ہوتے ہیں۔اس میں یقیناً ہمارے لئے اطمینان بلکہ بشارت کا بہت کچھ سامان موجود ہے اور ہمیں اس پر تہہ دل سے اللہ تعالیٰ کا شکرادا کرنا چاہیے۔

اسی طرح شکر کے لائق ایک اور بات یہ ہے کہ ہماری اس اجتماعیت میں اس بیس سال کے عرصے میں کوئی ہنگامہ برپا نہیں ہوا، کوئی بڑا اختلاف رونما نہیں ہوا۔ انجمنوں اور اداروں کی زندگیوں میں بڑے بڑے طوفان آتے ہیں اور ایسے بڑے اختلافات اور جھگڑے پیدا ہوتے ہیں کہ بعض اوقات ادارے کی بِساط[(۲)] تک لپیٹنے کی نوبت آجاتی ہے۔اس لئے کہ عام طور پر انجمنوں کا نظام بڑا ڈھیلا ڈھالا ہوتا ہے،اس میں بالعموم کچھ سرکردہ شخصیتوں کا ٹکراؤ ہوجایا کرتا ہے اور باہم کھینچ تان عام طور پر جاری رہتی ہے جونہایت مضر اثرات کی حامل ہوتی ہے۔الحمدللہ،ثم الحمدللہ ہمارا یہ ادارہ اس نوع کی خرابیوں سے بالکل محفوظ رہا ہے۔یہ قرآن اکیڈمی انجمن کی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز رہی ہے اور یہاں آس پاس کے رہنے والے بخوبی واقف ہیں کہ ایسا کوئی ناخوشگوار واقعہ الحمدللہ یہاں کبھی پیش نہیں آیا۔گذشتہ بیس سال کے دوران مرکزی انجمن کے کسی بھی فنکشن[(۳)] میں، خواہ وہ عمومی اجلاس ہو اور خواہ مجلس منتظمہ کی خصوصی میٹنگ ہو،کبھی کوئی تلخی نہیں ہوئی،کبھی کسی تُو تکار[(۴)] کی نوبت نہیں آئی۔یہ اللہ کا بہت بڑا فضل وکرم ہے____ شکر کے بارے میں میں نے بارہا اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ جب تک انسان کو پورا شعور حاصل نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر کتنا بڑا فضل اور انعام ہوا ہے، اس وقت تک اس کے متناسب (Proportionate) شکرادا نہیں کیا جا سکتا۔یہ ادراک[(۵)] اور شعور کہ مجھ پر اللہ کا کتنا بڑا احسان اور کتنا عظیم فضل ہوا ہے، بڑی اہمیت کا حامل ہے۔جتنا یہ شعور اور احساس گہرا ہوگا جذبۂ تشکر بھی اتنی ہی گہرائی سے برآمد ہوگا اور اسی قدر قوت کے ساتھ یہ جذبۂ شکر ایک چشمہ کی مانند قلب کی گہرائیوں سے اُبلے گا۔

---

(۱)موافق (۲)بستر (۳) Function (۴) تلخ کلامی (۵)فہم

میں تھیں، وہ پھر بعد میں مدینہ تشریف لائی تھیں۔

بہر حال میں نے یہ چند مثالیں دی ہیں کہ تحریکوں اور جماعتوں میں کچھ نہ کچھ لوگوں کی تو اس طرح آمد ورفت رہتی ہے۔ نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے دور میں یہ بہت کم تھی اور آج کے دور میں غلبہ واقامتِ دین کیلئے جو بھی تحریک اُٹھے گی اس میں یقیناً ایسے واقعات نسبتاً زیادہ ہوں گے، لیکن الحمدللہ تنظیم اسلامی کو قائم ہوئے سترہ برس ہو چکے ہیں، اس میں کوئی بڑا ہنگامہ یا کوئی بڑا اختلاف رونما نہیں ہوا، کسی بڑی تعداد میں لوگوں کی اس سے علیحدگی کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا، اور یہ چیز یقیناً ایسی ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا ادراک اور شعور کرتے ہوئے کہ ہمارے اس کام کی رفتار گو کم رہی لیکن اس میں دوام، تسلسل اور تواتر رہا ہے، اپنے قلب کی گہرائیوں سے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ اگر یہ قافلہ اسی دوام اور تسلسل سے چلتا رہے تو میں سمجھتا ہوں کہ زیادہ پائیدار نتائج برآمد ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

توازن واعتدال —— ایک اہم وصف

دوسرے بات جس پر ہمیں صمیم قلب [(۱)] کے ساتھ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور خاص طور پر میں اپنی ذات کے حوالے سے بار بار اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں، یہ ہے کہ جیسے ہماری تنظیم میں تسلسل اور تواتر موجود ہے اسی طرح یہاں توازن اور اعتدال کا وصف بھی الحمدللہ پایا جاتا ہے۔ یہ وصف اپنی جگہ نہایت ضروری بھی ہے اور اہم بھی۔ اکثر تحریکوں میں یہ ہوتا ہے کہ ایک مرحلے کے بعد جب وہ تحریک دوسرے مرحلے میں داخل ہوتی ہے تو پہلے مرحلے کی اہمیت نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ جیسے ایک انسان جب سیڑھی کے ذریعے چھت پر چڑھ جائے تو پھر سیڑھی کی اہمیت اس کی نگاہ میں نہیں رہتی، اس لئے کہ جو مقصد اس سے حاصل کرنا تھا وہ حاصل کر لیا، الحمدللہ کہ ذاتی طور پر میں اس معاملے کی اہمیت کو محسوس کرتے

---

(۱) خلوص دل

الصّف میں بھی بالکل ساتھ ساتھ آیا ہے۔سورۃ الصّف کی یہ آیات تو اکثر حضرات کو یاد ہوں گی اور ان کا مفہوم بھی ذہن میں ہوگا:

﴿يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ ط وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ○ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ لا وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○﴾

''وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو بجھا دیں اپنے مونہوں کی پھونکوں سے اللہ تعالیٰ اپنے نور کی تکمیل کر کے رہے گا خواہ یہ بات کافروں کو کتنی ہی ناپسند ہو۔ اس نے اپنے رسول کو بھیجا ہے کامل ہدایت (قرآن) دے کر اور اور ایک عدل کا نظام دے کر تا کہ اسے کل کے کل نظام زندگی پر غالب کر دیں خواہ یہ بات مشرکوں کو کتنی ہی ناپسند ہو''۔

اور سورۃ التوبہ کے الفاظ یہ ہیں:

﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (۳۲) هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ لا وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾

''اور وہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نور کو اپنے مونہوں کی پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرے گا مگر وہ اپنے نور کو مکمل کر کے رہے گا خواہ یہ بات ان کافروں کو کتنی ہی ناگوار گزرے۔ وہی ہے اللہ جس نے بھیجا اپنے رسول کو کامل ہدایت کے ساتھ اور نظام حق کے ساتھ......تا کہ وہ دین کو کل کے کل نظام زندگی پر غالب کر دیں......خواہ مشرکوں کو کتنا ہی برا لگے''۔

ذرا غور کیجئے،قرآن حکیم کے یہ دونوں مقامات اسلوب کے اعتبار سے کتنے مشابہ ہیں، بلکہ الفاظ بھی کم وبیش بالکل ایک سے ہیں،صرف پہلی آیت کے بعض الفاظ ایک دوسرے سے کچھ مختلف نظر آتے ہیں۔ ورنہ آیت کا مفہوم ایک ہی ہے۔ یہاں دو مقاصد کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ نے دوٹوک الفاظ میں فرمایا کہ یہ دونوں کام اب پورے ہوکر رہیں گے چاہے

ہوئے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ میں دعوت رجوع الی القرآن کا جو کام شروع کیا تھا اس میں ابتدائی چھ سات برس میں نے تن تنہا کام کیا۔ اس وقت انجمن خدام القرآن کا وجود نہیں تھا۔ اس کے بعد 1972ء میں یہ انجمن قائم ہوئی۔ پھر 1975ء میں تنظیم اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ تو درحقیقت میرے پیش نظر یہ دو کام ہیں جو قریباً متوازی اور متساوی[ا] ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میری زندگی میں اس میں سے کس کو زیادہ اہمیت حاصل ہے، بلکہ یہ کہنا شائد زیادہ مناسب ہوگا کہ ان کا معاملہ ایسے ہی ہے جیسے کہ ایک گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں۔ ان میں سے پہلے کام کا عنوان ''دعوت رجوع الی القرآن'' ہے جس کیلئے مرکزی انجمن خدام القرآن وجود میں آئی اور دوسرا کام جس کیلئے تنظیم اسلامی تشکیل دی گئی ہے، غلبہ وا قامت دین کی جدوجہد سے عبارت ہے۔ رفقاء واحباب جانتے ہیں کہ اب بھی میری توانائیوں کا کافی بڑا حصہ پہلے کام یعنی دعوت رجوع الی القرآن میں کھپ رہا ہے۔ ایسا نہیں ہوا کہ میں سمجھا ہو کہ اس کام کا تعلق تو میرے جہادِ زندگانی کے ابتدائی مرحلے سے تھا اور اب مجھے تحریک، تنظیم اور انقلاب ہی کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جانا چاہیے۔ الحمدللہ کہ اس معاملے میں میرا طرزِ عمل توازن واعتدال پر مبنی رہا ہے۔

''اتمامِ نور'' اور ''غلبۂ دین حق'': گاڑی کے دو پہیے

اس سال ملتان میں دورہ ترجمۂ قرآن کے دوران پہلی مرتبہ میرا ذہن اس حقیقت کی جانب منتقل ہوا کہ قرآن مجید میں دو مقامات پر گاڑی کے ان دو پہیوں کا ذکر ساتھ ساتھ آیا ہے۔ یہ محاورہ کہ گاڑی دو پہیوں پر چلتی ہے اس اعتبار سے بڑا معنی خیز ہے کہ اگر ایک پہیہ جام ہو جائے گا تو گاڑی گھومنے لگے گی، آگے نہیں بڑھے گی۔ اس کے دونوں پہیے چل رہے ہوں تو پھر گاڑی کیلئے ممکن ہوگا کہ وہ ایک خطِ مستقیم میں آگے کی طرف پیش قدمی کر سکے۔ گاڑی کے جن دو پہیوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان کا تذکرہ سورۃ التوبہ میں بھی اور سورۃ

(ا) برابر

تمہارے لئے تمہارے ''دین'' کو کامل کر دیا، یعنی وہ دین حق جس کا غلبہ واظہار بعثت محمدی ﷺ کا اصل مقصد ہے، آج مکمل ہو گیا، ''وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ'' اور تم پر اپنی نعمت کا اتمام فرما دیا۔ اس سے مراد نورِ ہدایت کا اتمام اور تکمیل ہے جس کا ذکر سورۃ الصّف میں ''وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوۡرِہٖ'' کے الفاظ میں وارد ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اتمام نور یعنی اتمام ہدایت ہی درحقیقت اتمام نعمت ہے۔ گویا اصل نعمت ہے ہی نعمت ہدایت! دنیا کی کوئی شے نعمت نہیں ہے جب تک نعمت ہدایت اس کے ساتھ شامل نہ ہو۔ نعمت ہدایت کے بغیر دولت، صحت، اولاد، اقتدار غرضیکہ کوئی شے نعمت نہیں ہے، بلکہ یہ سب عذاب کا موجب بن جانے والی چیزیں ہیں، ان کا غلط استعمال انسان کو ہلاکت و بربادی سے دوچار کر دے گا۔ ہاں اگر ہدایت موجود ہو تو پھر اولاد بھی نعمت ہے، پھر دولت بھی ایک عظیم نعمت سے کم نہیں کہ انسان اسے زیادہ سے زیادہ اللہ کی راہ میں خرچ کرے گا۔ اسی طرح ہدایت اگر موجود ہو تو صحت بھی نعمت ہے کہ انسان اللہ کے دین کیلئے بھاگ دوڑ کرے گا، محنت اور مجاہدہ کرے گا۔ نعمت ہدایت کے ساتھ ذہانت بھی ایک نعمت شمار ہوگی کہ اس کا استعمال اللہ کے دین کیلئے ہوگا، ورنہ یہی ذہانت انسان کو Evil Genius[۱] بنا دے گی اور انسان کی اُخروی تباہی کا ذریعہ بن جائے۔ تو معلوم ہوا کہ اصل نعمت ہے ہی نعمتِ ہدایت![۲]

ایک قابلِ لحاظ فرق

اب یہ بات نوٹ کیجئے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں تو نورِ ہدایت بھی مکمل ہو گیا اور دین حق کا غلبہ واظہار بھی سرزمین عرب کی حد تک مکمل ہو گیا، گویا گاڑی کے یہ دونوں پہیے مساوی انداز میں ساتھ ساتھ چلتے اور آگے بڑھتے رہے، لیکن حضور ﷺ کے دور کے بعد ان دونوں چیزوں کے درمیان ایک فرق واقع ہو گیا۔ اس فرق کو اچھی طرح سمجھ لینا

---

(۱) بُرے کاموں کیلئے ذہین

(۲) تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمایئے ڈاکٹر صاحب کا کتابچہ ''دنیا کی عظیم ترین نعمت قرآن مجید''

مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو اور چاہے کافروں کو کتنا ہی ناپسند ہو!! ایک مقصد ہے اتمامِ نور، جس کیلئے سورۃ الصّف میں الفاظ آئے "وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ" کہ اللہ اپنے نور کا اتمام[۱] فرما کر رہے گا۔ خواہ یہ بات کافروں کو کتنی ہی ناپسند ہو اور دوسرا کام یا دوسرا مقصد اگلی آیت میں بیان ہوا، جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو اس لئے بھیجا ہے کہ وہ دینِ حق کو غالب کرے خواہ یہ چیز مشرکوں کو کتنی ہی ناپسند ہو!

موخر الذکر بات سورۃ التوبہ میں بھی بعینہٖ انہی الفاظ میں آئی ہے، ایک شوشے کا بھی فرق نہیں ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾

پہلی آیت میں تھوڑا سا لفظی فرق موجود ہے۔ سورۃ الصّف میں فرمایا۔ "يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا" جبکہ سورۃ التوبہ میں "يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِئُوْا" کے الفاظ آئے۔ یعنی ایک حرف ناصب کی جگہ دوسرا حرف ناصب آ گیا۔ اسی طرح سورۃ الصّف میں "وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ" کے الفاظ ہیں جبکہ سورۃ التوبہ میں اسی مفہوم کو "وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ" کے الفاظ میں بیان فرمایا گیا، جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ بہر طور اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا، خواہ یہ کافروں کا کتنا ہی ناپسند ہو!

گاڑی کے انہی دونوں پہیوں کو سورۃ المائدہ کی اس عظیم آیت میں بھی جمع کیا گیا جو بڑی مشہور ہے اور جس کے بارے میں یہود کے بعض علماء نے کہا تھا کہ یہ آیت جو تم مسلمانوں کو عطا ہوئی ہے اگر ہمیں عطا ہوتی تو ہم اس کے یومِ نزول کو اپنا سالانہ جشن اور سالانہ عید قرار دیتے[۲]۔ اس آیت کے الفاظ پر توجہ مرکوز کیجئے۔ فرمایا﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ وہی دونوں چیزیں یہاں جمع کر دی گئیں: "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ"، کہ آج کے دن میں نے

---

(۱) تکمیل (۲) صحیح بخاری

یہ الگ بات ہے کہ ہمیں اس نعمت کی قدر نہیں ہے اور ہم دنیا کی حقیر سی چیزوں کو اس نعمت عظمٰی [۱] پر ترجیح دیتے ہیں۔ بہر کیف پہلے کام یعنی ''اتمام نور'' کے ضمن میں ہمارے ذمے صرف ایک کام باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ نورِ ہدایت موجود ہے، اسے عام کیا جائے، اس کا اِفشاء [۲] کیا جائے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ چراغ جلا کر بلندی پر رکھا جاتا ہے، اسے نیچے کہیں چھپا کر نہیں رکھا کرتے۔ چراغ اگر بلندی پر ہوگا تو ماحول کو منور کرے گا، اس کی روشنی پھیلے گی۔ تو نورِ ہدایت کا عام کرنا، اس سے ماحول کو منور کرنا اور اس کا افشاء کرنا ہمارے ذمہ ہے۔ یہی بات اس حدیث نبوی ﷺ میں آئی ہے جو حضرت عُبَیْدہ المُلَیکی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے [۳]۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ)) اے قرآن والو، قرآن کو تکیہ نہ بنا لینا یعنی اسے محض ذہنی سہارا نہ بنا لینا۔ بلکہ: ((وَاتْلُوْہُ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ اٰنَاءَ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ)) اس کی تلاوت کیا کرو جیسے کہ اس کی تلاوت کا حق ہے، رات اور دن کے اوقات میں ((وَاَفْشُوْہُ)) اور اسے عام کرو، اسے پھیلاؤ، چہار دانگ عالم [۴] تک اس کا نور پہنچا دو!

اسی بات کا ایک منطقی نتیجہ اور بھی نکلتا ہے جس کا ذکر عظمت قرآن کے بیان میں اس طویل حدیث میں آیا ہے جس کے راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ((وَمَنِ ابْتَغَی الْھُدٰی فِیْ غَیْرِہٖ اَضَلَّہُ اللّٰہُ)) [۵] کہ جو شخص اس قرآن کو چھوڑ کر کہیں اور ہدایت تلاش کرے گا اللہ اسے لازماً گمراہ کر دے گا۔ جب ہدایت و رہنمائی کا اتنا حتمی اور یقینی منبع و سرچشمہ اور اتنا مکمل Source (ذریعہ) تمہارے پاس موجود ہے، تو اس کے ہوتے ہوئے ہدایت و رہنمائی کیلئے دائیں بائیں دیکھنا گویا انتہا درجے کی ناقدری ہی نہیں قرآن مجید کی توہین کے مترادف [۶] ہے۔ البتہ اس کا یہ مفہوم سمجھنا بھی درست نہ ہوگا کہ قرآن کے سوا اور کچھ پڑھنا ہی نہیں چاہیے! اور چیزوں کا مطالعہ کیجئے، تورات پڑھئے،

---

(۱) عظیم نعمت (۲) پھیلانا (۳) مشکاۃ المصابیح بحوالہ شعب الایمان

(۴) پوری دنیا (۵) سنن ترمذی (۶) حوالہ اگلے صفحہ پر

چاہیے۔

دیکھئے اتمامِ نور تو قرآن کی شکل میں ہوا کہ 23 برس میں قرآن حکیم کا نزول مکمل ہوا۔ اس طرح اتمامِ نور ہو گیا اور اس نور کو قیامت تک کیلئے محفوظ کر لیا گیا، اس میں اب کہیں کوئی تحریف نہیں ہو سکتی۔ لیکن اقامت دین کے مرحلہ کی تکمیل کا کام جس کیلئے سورۃ الصّف میں ''اظهار دين الحق على الدين كله'' کی اصطلاح آئی ہے، حضور ﷺ کے زمانے میں ایک حد تک مکمل ہو گیا تھا کہ اندرون ملک عرب دین حق کا پرچم لہرانے لگا۔ پھر دورِ خلافت راشدہ میں اس کی توسیع بڑے بھرپور انداز میں ہوئی۔ لیکن پھر ایک وقت آیا کہ یہ عمل رُک گیا، بلکہ رفتہ رفتہ دین کی یہ عالیشان عمارت منہدم ہونے لگی، یہاں تک کہ بالکل زمین بوس ہو گئی۔ اب صورت یہ ہے کہ اسلام محض ایک مذہب کے طور پر تو باقی ہے لیکن دین حق اور نظام اسلام اپنی صحیح صورت میں زمین کے کسی ایک خطے میں بھی قائم و نافذ نہیں، اور اب غلبہ و اقامت دین کی جدوجہد ہمیں از سرِ نو[(۱)] کرنی ہوگی _____ تو یہ ہے وہ بڑا فرق جو اس معاملے میں واقع ہوا کہ دونوں کام جو نبی اکرم ﷺ کے دور میں گاڑی کے دو پہیوں کی مانند ساتھ ساتھ چل رہے تھے بعد میں ہم آہنگ[(۲)] نہ رہ سکے۔

اتمامِ نور کے ضمن میں ہماری ذمہ داری

جہاں تک نورِ ہدایت کے اتمام کا تعلق ہے ہم مسلمانوں کیلئے یہ کتنی بڑی سہولت ہے کہ ہمیں پورا یقین اور اعتماد ہے کہ اس ''کتاب'' میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا کلام ہے اور اس کا ایک حرف بھی ضائع نہیں ہوا۔ اس لئے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے لیا ہے۔ ﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ﴾ (الحجر:09) (ہم ہی نے اس قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)۔ قرآن حکیم اپنی جگہ خود بھی اللہ کی عظیم ترین نعمت ہے اور اللہ کا مزید فضل و کرم ہم پر یہ ہوا کہ اس کی حفاظت کا ذمہ بھی اس نے لے لیا۔

---

(۱) نئے سرے سے　　(۲) ساتھ ساتھ رہنا

وارننگ (۱) ہمیشہ اس کے پیش نظر رہنی چاہیے کہ:((وَمَنِ ابْتَغَى الْهُدٰى فِيْ غَيْرِهٖ اَضَلَّهُ اللّٰهُ))

خلاصہ کلام یہ کہ اس اعتبار سے تو اتمامِ نور ہو گیا کہ قرآن حکیم کا نزول حضور اکرم ﷺ پر مکمل ہوا اور اللہ نے قیامت تک کیلئے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا، لیکن اس ضمن میں ایک کام ہمارے ذمے باقی ہے اور وہ ہے اس نورِ ہدایت کا عام کرنا، جس کیلئے حدیث میں ''وَاَفْشُوْهُ'' کا لفظ آیا ہے کہ اسے پھیلاؤ اور عام کرو اور یہ افشاء ہر سطح پر ہوگا، عوام کی سطح پر بھی اسے پھیلانا ہوگا اور خواص کی سطح پر بھی، فلسفیوں اور دانشوروں تک بھی اس کے اِبلاغ (۲) کا حق ادا کرنا ہوگا اور شریر اور جھگڑالو لوگوں پر بھی مجادلہ حسنہ (۳) کے ذریعے حجت قائم کرنی ہوگی۔ یہ سب افشاء ہی کی مختلف سطحیں ہیں!

گاڑی کا دوسرا پہیہ: غلبہ دین کی جدوجہد

اس گاڑی کا جو دوسرا پہیہ ہے یعنی غلبہ دین حق، اس کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں ''وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ'' کی شان ظاہر ہوئی اور دین حق کا غلبہ ملک عرب کی حد تک مکمل ہو گیا پھر خلافت راشدہ کے دوران کرہ ارضی کے ایک بہت بڑے رقبے پر دین حق غالب و نافذ ہوا اور اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ لیکن پھر اس معاملے میں زوال کا آغاز ہو گیا اور تدریجاً زوال کے سائے گہرے ہوتے چلے گئے۔ یوں سمجھے کہ سب سے پہلے قصر اسلام کی چھٹی منزل گری، پھر پانچویں منزل منہدم (۴) ہوئی، پھر چوتھی اور پھر تیسری اور اس طرح آج سے قریباً ڈیڑھ دو سو برس قبل پوری عمارت زمین بوس ہوگئی۔ چنانچہ اب اس کی تعمیر از سرنو کرنی ہوگی۔ بہر کیف اس وقت صرف اسی نکتے کی جانب متوجہ کرنا مقصود تھا کہ یہ دو کام بالکل متوازی

---

(۱) تنبیہ (Warning) (۵) پہنچانا (۳) اچھے طریقے سے بحث ومناظرہ کرنا
(۴) گری

انجیل پڑھیئے، لیکن انہیں منبع وسر چشمۂ ہدایت سمجھ کرنہیں بلکہ محض اپنی معلومات میں اضافے کیلیئے ان کا مطالعہ کیجئے۔ وہ اسی کتابِ ہدایت کے سابقہ ایڈیشن ہیں جس کا تکمیلی ایڈیشن قرآن حکیم ہے۔اسی طرح دوسرے علوم بھی اپنی معلومات میں اضافے کیلیئے پڑھے جاسکتے ہیں، بلکہ دوسرے علوم کوقرآن مجید کے فہم کا ذریعہ سمجھ کر سیکھیئے اور پڑھیئے ،اس لئے کہ انسانی ذہن کا ظرف جتنا وسیع اور کشادہ ہوگا اسی کی مناسبت سے قرآن مجید سے ہدایت اورعلم و معرفت کے موتی انسان اپنے دامن میں سمیٹ سکے گا۔ دامن ہی اگر تنگ ہوتو انسان کے حصے میں حکمت ومعرفت کے موتی بھی کم ہی آئیں گے۔گویاع ''پھول کھلے ہیں گلشن گلشن، لیکن اپنا اپنا دامن!'' قرآن مجید کے اندرتو ہدایت،علم اورمعرفت کی کوئی کمی نہیں،ان کے جواہر سے یہ مَعدِن (۱) بھرا پڑا ہے لیکن تمہاری اپنی تنگ دامنی آڑے آجائے تو اس کا کیا علاج؟

واضح رہے کہ دوسرے علوم کے ذریعے سے قرآن مجید کی حقانیت کا مزید مُبرہَن (۲) ہو جانا خودقرآن مجید سے ثابت ہے۔سورۃ حٰم السجدۃ میں فرمایا گیا:

﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ﴾

''ہم انہیں اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں بھی اور انفس میں بھی،حتیٰ کہ یہ بات بالکل واضح ہوجائے گی کہ یہ قرآن مجید ہی سراسر حق ہے''۔

گویا کہ جتنا انسان کے علم کا دائرہ وسیع ہوگا قرآن مجید کی حقانیت اسی درجے میں مزید مبرہن ہوجائے گی ،اسی قدر اس کا اثبات زیادہ ہوگا۔ان اعتبارات سے سے دوسرے علوم سے اعتناء (۳) کرنے یاان سے دلچسپی رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔لیکن ایک بندۂ مومن کیلیئے یہ احساس وشعور لازم ہے کہ منبع ہدایت سوائے قرآن کے اور کوئی نہیں! حضورﷺ کی یہ

---

(٦) دائیں بائیں دیکھنے میں حدیث وسنت رسولؐ شامل نہیں ہے بلکہ یہ قرآن ہی کے ذیل میں شامل ہیں۔قرآن وسنت کا باہمی تعلق اسی کتاب کے صفحہ نمبر 28 / 29 پر ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) کان (۲) واضح (۳) توجہ کرنا

ختم ہو گیا۔ تو میرے لئے یہ بات بڑے اطمینان کی ہے اور اس پر بھی میں جتنا اللہ کا شکر ادا کروں کم ہے اور میرے ساتھیوں کو بھی اس پر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنا چاہیے۔ بالخصوص یہ جو بنیادی کام دعوت رجوع الی القرآن کا ہے اس کے حوالے سے میں سمجھتا ہوں کہ بحمد للہ اب ایک ایسی نسل ثانی [1] تیار ہو چکی ہے اور کم وبیش چالیس پچاس نوجوانوں پر مشتمل ایک ایسی ٹیم وجود میں آ چکی ہے جو درسِ قرآن کے اس تسلسل کو انشاءاللہ برقرار رکھے گی جس کا میں نے کبھی 1965ء میں آغاز کیا تھا۔ مجھے اطمینان ہے کہ دروس قرآن کے حوالے سے قرآن کا انقلابی فکر اور اس کا صغریٰ کبریٰ ان کے ذہن وفکر کی گرفت میں آ چکا ہے، اس میں جو منطقی ترتیب (Logical Sequence) ہے اسے انہوں نے خوب اچھی طرح سے سمجھ لیا ہے اور وہ اب اس قابل ہیں کہ اسے بیان بھی کر سکیں۔ ظاہر بات ہے کہ صلاحیت بیان میں نکھار تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور اس صلاحیت کو زیادہ سے زیادہ بروئے کار لانے ہی سے پیدا ہوگا۔ لیکن اصل شے بنیادی فکر اور سکے طرزِ استدلال کا ذہن کی گرفت میں آنا ہے جو الحمد للہ انہیں حاصل ہے۔ اس کے بعد تو پھر اپنی اپنی محنت اور کوشش ہے۔ اس فکر قرآنی کو عام کرنے اور بیان کرنے میں جتنی محنت اور جس درجے پیہم [2] کوشش ہو گی اسی نسبت سے ان کی صلاحیت نکھرے گی۔ چنانچہ گزشتہ سالانہ اجتماع کے موقع پر میرا کوئی درسِ قرآن نہیں ہوا تھا بلکہ درسِ قرآن میرے نوجوان ساتھیوں نے دیا۔ اس سال بھی سالانہ اجتماع میں انہی نوجوان ساتھیوں نے دروسِ قرآن دیئے۔

ذیلی انجمنوں اور ان کے تحت اکیڈمیز کا قیام

اسی طرح یہ بات بھی بڑی خوش آئند اور لائق تشکر ہے کہ مرکزی انجمن کی کوکھ سے اب تک کئی منسلک اور ذیلی انجمنیں برآمد ہو چکی ہیں۔ 20 / اپریل 1992ء کو مرکزی انجمن کو جو اجلاسِ عام ہوا اس میں پہلی مرتبہ بہت سے حضرات کے سامنے یہ بات آئی ہو گی کہ

---

(۱) دوسری نسل (۲) مسلسل

(Parallel) ہیں، قرآن مجید نے دونوں مقامات پر یعنی سورۃ التوبہ اور سورۃ الصّف میں ان دونوں کو بااہتمام یکجا بیان کیا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ ان دونوں کو متوازی اور متساوی انداز میں آگے بڑھایا جائے۔ ان میں توازن و اعتدال برقرار رہنا چاہیے۔ اور اس پر بھی میں اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے کہ اس کے فضل و کرم کے طفیل یہ دونوں چیزیں ہمارے یہاں بالکل متساوی اور متوازی شکل میں چل رہی ہیں۔ مرکزی انجمن خدام القرآن اور اس کے تحت قائم ہونے والی قرآن اکیڈمی اور اسی طرح ذیلی انجمنیں اور ذیلی اکیڈمیز جو وجود میں آ رہی ہیں یہ سب درحقیقت ہماری گاڑی کے ایک پہیے کے مظاہر ہیں جو الحمدللہ نہ صرف یہ کہ ایک تسلسل کے ساتھ رواں دواں ہے بلکہ ان کی رفتار میں بتدریج اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ دوسرا پہیہ تنظیم اسلامی سے عبارت ہے جس کی حرکت کو تیز کرنے کیلئے ہم نے ''تحریکِ خلافت'' کا عنوان اختیار کیا ہے۔ لیکن تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت اصلاً ایک ہی کام کے دو گوشے یا دو مرحلے ہیں اور تمام تر کام کا ہدف ایک ہی ہے، یعنی دین حق کا غلبہ و اقامت ۔ چنانچہ فی الاصل کام دو ہی ہیں جو ایک دوسرے کے متوازی ہیں۔ ایک ہے رجوع الی القرآن کی دعوت جس کیلئے مرکزی انجمن سرگرمِ عمل ہے اور دوسرا ہے اقامتِ دین کی جدوجہد جس کی خاطر تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت برسرِ عمل ہیں۔

تحریک رجوع الی القرآن کا تسلسل ایک لائق شکر وقابل اطمینان پہلو

تیسری بات جس پر میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہتا ہوں اور جس کا میں نے بارہا ذکر بھی کیا ہے، یہ ہے کہ اس کام کے باقی اور جاری رہنے کا اہتمام اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہو گیا ہے۔ مجھے اپنی زندگی میں یہ نظر آ رہا ہے اور مجھے یہ اطمینان حاصل ہے کہ اس کام کا تسلسل ان شاء اللہ برقرار رہے گا۔ یہ بھی یقیناً اللہ کا بہت بڑا فضل ہے ۔ ورنہ بعض بڑی نامور ہستیاں ایسی ہو گزری ہیں کہ جنہوں نے اپنی زندگیوں میں بڑے بڑے کام کر کے دکھائے لیکن ان کے جانے کے بعد اس کام کا تسلسل قائم نہیں رہ سکا۔ ایک آدمی منظر سے ہٹا اور کام

موجود ہے۔ وہاں اکیڈمی کے لئے بعض مخیّر خواتین نے ایک خاصا وسیع قطعۂ زمین ہمیں ہبہ [1] کیا ہے اور اب وہاں بھی تعمیر کا کام شروع ہوا چاہتا ہے۔ مجھے پوری توقع ہے کہ اس سالانہ اجلاس عام کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ ان شاء اللہ العزیز پشاور، رحیم یار خان، حیدر آباد اور اسلام آباد میں بھی بہت جلد ذیلی انجمنوں کا قیام عمل میں آ جائے گا۔ اور ہوسکتا ہے کہ اسی سال کے دوران وہاں اکیڈمیز کا کام بھی شروع ہو جائے۔

دورہ ترجمہ قرآن: تحریک رجوع الی القرآن کا ایک اہم سنگِ میل

اسی طرح یہ بات بھی بڑی خوش آئند ہے کہ اس سال ماہ رمضان المبارک میں دورہ ترجمہ قرآن کا پروگرام قریباً گیارہ بارہ جگہوں پر ہوا ہے۔ اس کے ضمن میں تو مجھے کبھی کبھی حفیظ کا یہ شعر یاد آتا ہے کہ ؎

کیا پابندِ نَے [2] نالے [3] کو میں نے
یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری

یہ بات میں نے بغیر کسی عُجب [4] کے محض امرِ واقعہ کے طور پر عرض کی ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کا فضل ہے کہ اس نے میرے ذہن کو ادھر منتقل کیا۔ ہم نے جب نمازِ تراویح کے ساتھ بیان القرآن کا آغاز کیا تو شروع میں تراویح کے اختتام پر یا کبھی بیچ بیچ میں پندرہ بیس منٹ یا آدھ گھنٹے کا بیان ہوتا تھا۔ اس کے بعد میرا ذہن اس حقیقت کی جانب منتقل ہوا کہ احادیث مبارکہ میں تو رمضان المبارک کے دوگونہ پروگرام کا ذکر ملتا ہے یعنی دن کا روزہ اور رات کا قیام قرآن حکیم کے ساتھ، یہ دونوں بالکل متوازی پروگرام ہیں۔ اس پہلو سے محض نمازِ تراویح ادا کرنے یا ایک آدھ گھنٹے میں خلاصۂ مضامین کے بیان سے تو رمضان المبارک کا حق ادا نہیں ہوتا۔ چنانچہ پھر دورۂ ترجمۂ قرآن کا پروگرام شروع کیا گیا اور یہ بحمد للہ آٹھواں یا نواں موقع تھا کہ مجھے دورہ ترجمۂ قرآن کی تکمیل کی سعادت حاصل

---

(۱) بلا قیمت عطا کرنا (۲) بانسری (۳) گریہ زاری (۴) خود پسندی

پاکستان کے کئی شہروں میں مرکزی انجمن کے طرز پر منسلک انجمنیں قائم ہوچکی ہیں۔ یہ پہلی بار ہوا کہ ہمارے اس اجلاسِ عام میں ذیلی انجمنوں کے نمائندے بھی شریک ہوئے اور انہوں نے بھی اپنے اپنے علاقے کی انجمن خدام القرآن کا مختصر تعارف کرایا اور خدمت قرآن کے میدان میں اپنی پیش رفت کا بھی اختصار کے ساتھ ذکر کیا۔ اس سے بڑھ کر مقامِ شکر یہ ہے کہ ان انجمنوں کے زیر اہتمام قرآن اکیڈمیز کی تعمیر کا کام بھی شروع ہو چکا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ پہلی مرتبہ کسی کام کا شروع کرنا مشکل ہوتا ہے لیکن ایک بار محنت کرنے سے جب ایک Pattern اور عملی نمونہ سامنے آجاتا ہے تو اس کام کا کرنا مشکل نہیں رہتا۔ اس اعتبار سے ظاہر بات ہے کہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی تشکیل اور قرآن اکیڈمی کے قیام میں محنت بھی زیادہ صرف ہوئی اور وقت بھی بہت لگا۔ لاہور میں مسلسل پانچ چھ برس میں نے فکر قرآنی کی اشاعت کا کام تن تنہا کیا جس کے نتیجے میں بحمداللہ 1972ء مرکزی انجمن خدام القرآن وجود میں آئی۔ پھر مزید پانچ سال بعد قرآن اکیڈمی کی پہلی اینٹ رکھنے کی نوبت آئی۔ عمارت کی تعمیر بھی مرحلہ وار ہوئی۔ آغاز میں صرف دفاتر یا رہائشی بلاک کی تعمیر عمل میں آئی۔ پھر کئی برس بعد جا کر قرآن اکیڈمی میں دینی تعلیم کے دوسالہ کورس کا آغاز ہوا۔ اس طرح یہ داستان برسوں پر محیط ہے۔ اس لئے کہ یہ کام پہلی بار ہو رہا تھا۔ لیکن اب جبکہ اس کام کا ایک ہیولیٰ (۱) اور ابتدائی خاکہ بن چکا ہے اور اس کے بہت سے مراحلہ طے ہوچکے ہیں تو قوی امید ہے کہ بقیہ جگہوں پر مرکزی انجمن کی نہج (۲) پر جو کام ہو رہے ہیں ان میں اتنا وقت نہیں لگے گا بلکہ تیز رفتاری کے ساتھ انجمن کی تاسیس سے لے کر قرآن اکیڈمی کی تعمیر اور آغازِ تدریس تک کے مراحل طے کیئے جاسکیں گے۔ چنانچہ کراچی میں بحمداللہ کام کی رفتار تیز ہے۔ اب ملتان میں بھی اللہ کے فضل وکرم سے ایک اکیڈمی وجود میں آچکی ہے، اس سال رمضان میں وہاں میرا دورہ ترجمۂ قرآن بھی ہوا ہے اور اب اُمید ہے کہ زیادہ سے زیادہ ایک سال میں وہاں قرآن کالج کا آغاز ہوجائے گا۔ فیصل آباد میں منسلک انجمن

(۱) خاکہ (۲) طریقہ

لے لیا، اب ہمارا کام اس کا افشاء کرنا ہے۔ یعنی اسے چہار دانگ عالم تک پھیلانا اور ہر ممکن طریقے سے اس کا ابلاغ کرنا اب ہمارے ذمے ہے۔ اس کے لئے جہاں عوامی سطح پر قرآن کے ذریعے وعظ و نصیحت کا کام ضروری ہے وہاں دانشوروں (Intellectuals) کیلئے ان کی علمی سطح کے مطابق اس کا ابلاغ بھی اسی قدر ضروری اور لازمی ہے ___ دوسرا گوشہ اقامت دین کی جدوجہد کا ہے کہ قرآن کا پڑھنا، پڑھانا اور سیکھنا سکھانا محض ایک مشغلہ بن کر نہ رہ جائے بلکہ اس تعلیم و تعلم قرآن کے ساتھ ساتھ اس کا دوسرا پہیہ بھی متوازی چلنا چاہیے۔ غلبہ و اقامت دین کی جدوجہد اور اس کیلئے تنظیم اور تحریک کا کام بھی متوازن انداز میں آگے بڑھنا چاہیے۔ الحمدللہ کہ یہ دونوں کام بہت حد تک متوازن انداز میں آگے بڑھ رہے ہیں۔

تیسری بات یہ کہ آئندہ کے تسلسل کے بارے میں بھی مجھے اطمینان ہے کہ یہ کام ان شاء اللہ العزیز جاری رہے گا۔ ویسے بھی میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں اب عمر کے جس حصے میں ہوں اس کے بعد تو "نَافِلَةً لَّكَ" [1] کا درجہ رہ جاتا ہے۔ اسلئے کہ 26 / اپریل کو میری عمر کے ساٹھ برس مکمل ہو رہے ہیں اور مسنون عمر تو کل اکسٹھ یا ساڑھے اکسٹھ برس ہی بنتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی عمر 63 برس قمری حساب سے تھی، شمسی حساب سے یہ قریباً 61 برس بنتے ہیں۔ میری اس بات کو غلط مفہوم میں نہ لیا جائے کہ معاذ اللہ میں حضور اکرم ﷺ کے ساتھ اپنی کوئی مشابہت ثابت کرنا چاہتا ہوں بلکہ میں دیانتاً یہ سمجھتا ہوں اور اپنے ان قریبی ساتھیوں سے اکثر یہ بات کہتا ہوں جو اس عمر کو پہنچے ہوئے ہوں کہ ساٹھ اکسٹھ برس کی عمر کو پہنچنے کے بعد آدمی کو یہ سمجھنا چاہیے کہ مسنون عمر تو پوری ہوئی، اب بقیہ زندگی بونس ہے، یہ "نَافِلَةً لَّكَ" کے درجے کی چیز ہے۔ اس کا ایک ایک لمحہ اللہ کے دین کی خدمت کیلئے صرف ہونا چاہیے۔

---

(۱) قرآنی الفاظ: لفظی معنی: تیرے لئے اضافی طور پر، اضافی چیز، بونس

ہوئی___اس سال یہ پروگرام پانچ جگہوں پر ہوا۔ایک جگہ میں نے قرآن کا ترجمہ بیان کیا اور چار دیگر جگہوں پر میرے شاگردوں نے مکمل ترجمۂ قرآن بیان کیا۔مزید برآں دورانِ رمضان نمازِ تراویح کے ساتھ چار پانچ جگہوں پر ویڈیو کے ذریعے یہ پروگرام لوگوں نے دیکھا اور سنا۔رجوع الی القرآن کی یہ لہر الحمدللہ بڑھ رہی ہے اور اس میں لوگوں کا قرآن سے شغف [۱] اور تعلق بڑھ رہا ہے۔پوری رات قرآن حکیم اور اس کا مفہوم سننے سمجھنے میں جو لذت ہے اس کا اس سے پہلے لوگوں کو تجربہ نہیں تھا۔ع ''چوں معاملہ نہ دار وسخن آشنا نہ باشد!'' (جب تک باہم محبت کا رشتہ نہ ہوا اس وقت تک گفتگو کے اندر بھی وہ لوچ اور مٹھاس پیدا نہیں ہوتی۔) ہاں جب قرآن پاک سے تعارف ہو جائے اور اس سے ایک تعلق خاطر پیدا ہو جائے تو معاملہ بالکل مختلف ہو جاتا ہے، پھر پوری رات انسان قرآن پڑھنے پڑھانے یا سننے سنانے میں گزار دیتا ہے اور یہ چیز اس پر ہرگز گراں [۲] نہیں گزرتی!

اب تک کی گفتگو کا خلاصہ

اب تک کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ الحمدللہ ہمارے اس کام میں پیش رفت ہو رہی ہے اور تین اعتبارات سے معاملہ بہت اطمینان بخش ہے۔ایک یہ کہ گو ہمارے کام کی رفتار کچھ زیادہ تیز نہیں رہی تاہم الحمدللہ، ثم الحمدللہ اس میں تسلسل اور تواتر موجود ہے، طوفان کے مانند اٹھنے اور بگولے کی طرح رخصت ہو جانے کے مقابلے میں یہ سست رفتاری کہیں بہتر ہے اور ''سہج پکے سو میٹھا ہو'' کے مصداق توقع ہے کہ اس سے ان شاء اللہ پائیدار نتائج پیدا ہوں گے۔دوسری بات یہ کہ گاڑی کے دو پہیوں کی مانند ہمارے اس کام کے بھی دو بڑے بڑے گوشے ہیں اور الحمدللہ کہ ان کے مابین توازن واعتدال برقرار ہے۔ایک گوشہ رجوع الی القرآن کی تحریک کا ہے، جس کے پیش نظر قرآن حکیم کے نورِ ہدایت کو پھیلانا اور اس کے انقلابی فکر کو عام کرنا ہے۔اس نور کا اتمام اللہ تعالیٰ نے فرما دیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ بھی

(۱) بے انتہا رغبت (۲) دشوار

جدوجہد میں اس کا ذاتی حصہ (Contribution) کتنا ہے۔ اس لئے کہ اللہ کے ہاں تو حساب کتاب انفرادی بنیادوں پر ہوگا: ﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا﴾ (مریم : 95) وہاں تو ہر شخص انفرادی حیثیت میں پیش ہوگا۔ ہر شخص کو اس کا اعمال نامہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا جائے گا اور حکم ہوگا کہ ﴿اِقْرَاْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا﴾ (بنی اسرائیل:14) یہ تمہاری بیلنس شیٹ موجود ہے، اسے پڑھو اور آج اپنے حساب کیلئے تم خود ہی کافی ہو۔ تو ہم میں سے ہر شخص کا اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ دین کی جانب سے اس پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہ انہیں ادا کر رہا ہے یا نہیں!

قرآن حکیم کی بے مثال تاثیر اور قوت تسخیر

اب تک جو باتیں میں نے عرض کی ہیں وہ اس سے پہلے بھی مختلف مواقع پر بالخصوص ماہ رمضان المبارک کے دوران مختلف اجتماعات میں بیان کر چکا ہوں۔ آج میں ایک اور اہم بات آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں جو مرکزی انجمن خدام القرآن کے حالیہ سالانہ اجلاس کے موقع پر میں بطورِ تحفہ شرکاء اجتماع کے سامنے رکھنا چاہتا تھا، لیکن چونکہ وہاں ذیلی انجمنوں کے نمائندگان کی تقاریر زیادہ طویل ہوگئیں تو وقت کی کمی کے پیش نظر میں نے اپنی اس گفتگو کو ملتوی کر دیا۔ چنانچہ وہ تحفہ میں آپ کی خدمت میں اب پیش کر رہا ہوں اور اس کا تعلق قرآن مجید کی قوتِ تسخیر اور اس پر اعتماد اور توکل سے ہے۔

یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ بندہ مومن کیلئے اصل سہارا اللہ کی ذات ہے، اور خواہ کوئی ظاہری اور مادی سہارا موجود نہ ہو اور بظاہر ہر طرف سے مایوسی نظر آتی ہو، ایک بندہ مومن اللہ ہی پر توکل کرتا ہے اور اس کی رحمت کی آس لگائے رکھتا ہے۔ قرآن حکیم میں جابجا اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ ﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ یعنی اہل ایمان کو تو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے۔ لیکن میں آج جان بوجھ کر قرآن حکیم پر اعتماد اور توکل کے الفاظ استعمال کر رہا ہوں تا کہ لوگ چونکیں، ان کے ذہنوں میں سوال اٹھے اور وہ توجہ سے اس

ہماری تحریک اور شجرۂ طیبہ کی مثال

اس ضمن میں ایک اور نکتہ اشارتاً عرض کئے دیتا ہوں اور اس میں بھی میرے لئے اطمینان کا بہت کچھ سامان مضمر ہے۔ سورہ ابراہیم میں ایک پاکیزہ درخت کی جو مثال آئی ہے وہ ہمارے اس کام پر بحمدللہ بہت حدتک صادق آتی ہے۔ ﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ﴾ کسی بھی شجرۂ طیبہ یعنی پاکیزہ درخت کی یہ مثال ہے کہ اس کی جڑ مضبوطی کے ساتھ زمین میں قائم ہو اور اس کی شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہوں۔ الحمدللہ کہ ہمارے کام کی بھی یہی شان ہے۔ دعوت رجوع الی القرآن کا کام اس پوری تحریک کی جڑ کے مانند ہے جو مضبوطی کے ساتھ زمین میں پیوست ہے۔ اس میں ہماری صلاحیتیں اور ہمارے وسائل بھرپور طور پر صرف ہو رہے ہیں۔ تنظیم اسلامی اس شجرۂ طیبہ کے تنے کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے برگ و بار اور اس کی شاخوں کا مقام تحریک خلافت کو حاصل ہے۔ اللہ کو اگر منظور ہوا تو یہ کام ضرور آگے بڑھے گا۔

میں نے اپنا تجزیہ کئی مواقع پر آپ کے سامنے رکھا ہے کہ پاکستان کے استحکام اور اس کے بقا کا اگر کوئی راستہ ہے تو یہی ہے کہ یہاں وہ صحیح اور مکمل اسلامی نظام قائم ہو جس کا عنوان ''نظام خلافت'' ہے اگر پاکستان اور اہل پاکستان کیلئے اللہ نے کسی خیر کا ارادہ فرمایا ہے تو قوی امید ہے کہ یہ تحریک آگے بڑھے گی اور سرزمین پاکستان پر نظام خلافت کا قیام و نفاذ ہوگا۔ اس لئے کہ پوری دنیا کے اوپر اسلام کا جو غلبہ ہونا ہے جس کی صریح پیشین گوئیاں حضور ﷺ کی احادیث میں موجود ہیں، ظاہر بات ہے کہ اس عمل کا آغاز کسی ایک خطہ زمین ہی سے ہوگا اور اگر یہ اللہ کی مشیت میں ہے کہ اس عمل کا نقطہ آغاز سرزمین پاکستان بنے تو یقیناً غلبہ و اقامت دین کی یہ جدوجہد آگے بڑھے گی اور اس کی شاخیں آسمان سے باتیں کریں گی۔ ہاں ہم میں سے ہر شخص کو اپنی انفرادی حیثیت میں یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ اس

ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست ایں
زندہ و پائندہ و گویاست ایں

کہ میں تم سے صاف ہی کہہ دوں جو کچھ میرے دل میں ہے، یہ کتاب نہیں کچھ اور شے ہے۔اسے عام معنوں میں کتاب نہ سمجھو، یہ ''چیزے دِگر'' ہے۔یعنی جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات الظاہر بھی ہے اور الباطن بھی اسی طرح یہ کتاب بھی بیک وقت ان دونوں متضاد صفات کی حامل ہے۔اور جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات الحی اور القیوم ہے اسی طرح اس کا کلام بھی زندہ و پائندہ ہے۔قرآنِ حکیم کیلئے ''کتابِ زندہ'' کے الفاظ تو اقبال نے اور بھی کئی مقامات پر استعمال کئے ہیں۔مثلاً

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ اُو لایزال است و قدیم(۱)

بہر حال، حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کی قوتِ تسخیر کے بارے میں ہم نے بڑی ناقدری کا معاملہ کیا ہے۔ہمیں نہ تو قرآن حکیم کی عظمت کا ادراک حاصل ہے اور نہ اس کی قوتِ تسخیر پر اعتماد۔ہمیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ کتنی بڑی نعمت اور کیسی عظیم قوت ہے جو اللہ نے قرآن حکیم کی صورت میں ہمیں عطا فرمائی ہے۔

دو آیات —— دو عظیم بشارتیں

اسی ضمن میں سورۃ طٰہ کی ابتدائی دو آیات اور سورۃ القصص کی آیت 85 کے حوالے سے بھی میں ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔سورۃ طٰہ کی پہلی آیت حروفِ مقطعات پر مشتمل ہے ﴿طٰهٰ﴾ جبکہ دوسری آیت ﴿مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰۤی﴾ میں ایک عظیم حقیقت کا بیان ہے۔یہاں خطاب نبی اکرم ﷺ سے ہے کہ اے نبی، ہم نے آپ پر یہ

---

(۱) وہ زندہ کتاب قرآن حکیم جس کی حکمت لازوال بھی ہے اور قدیم بھی۔

بات کوسنیں کہ قرآن کی قوت تسخیر اور اس پر توکل و اعتماد کے بارے میں وہ کیا بشارتیں ہیں کہ جو خود قرآن مجید میں وارد ہوئی ہیں۔

قرآن حکیم کی شان

کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ بات آسکتی ہے کہ توکل کے لفظ کا قرآنِ حکیم کے ساتھ اس طور پر استعمال شائد کچھ غیر مناسب ہے۔ چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ اس بات کو پوری وضاحت سے بیان کروں۔ دیکھئے قرآن مجید ہی سے یہ بات ثابت ہے کہ جو تاثیر تجلی ذاتِ باری تعالیٰ کی ہے وہی تاثیر قرآن مجید کی بھی ہے۔ سورۃ الاعراف میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے بارہ گاہ رب العزت میں درخواست کی کہ ﴿رَبِّ اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ اِلَیْكَ﴾ کہ اے پروردگار میں تجھے بچشم سر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو یہ بات سمجھانے کی غرض سے کہ وہ تجلی ذاتِ حق کا تحمل نہ کر پائیں گے، اپنی تجلی پہاڑ پر ڈالی۔ قرآن حکیم نے اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے: ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا﴾ کہ حضرت موسیٰؑ اللہ تعالیٰ کی تجلی ذات کے بالواسطہ مشاہدے کا تحمل بھی نہ کر سکے اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ یہی بات قرآن مجید کی عظمت کے بارے میں ایک تمثیل کے پیرائے میں سورۃ الحشر میں آئی ہے: ﴿ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ﴾ (الحشر:21) یعنی ”اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتار دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ دب جاتا اور پھٹ جاتا اللہ کی خشیت سے“۔ تو درحقیقت جو تاثیر تجلی باری تعالیٰ کی ہے وہی ہیبت اور دبدبہ کلامِ باری تعالیٰ کا ہے۔ ان دونوں میں اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ اس حقیقت کو بھی علامہ اقبال نے خوب سمجھا اور بڑی خوبصورتی سے اشعار کے قالب میں ڈھالا ہے۔ میرے علم کی حد تک اس دور میں اور کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ جس کے ذہن کی رسائی یہاں تک ہوئی ہو۔ فرماتے ہیں:

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است

پوشیدہ ہے، قدم قدم پر اس کے مظاہر تمہارے سامنے آئیں گے اور تم بچشمِ سر[۱] ان کا مشاہدہ کرسکو گے۔

اس ضمن میں تیسری آیت جس کا میں حوالہ دینا چاہتا ہوں، سورۃ القصص کے آخری حصے میں وارد ہوئی ہے۔ تفسیری اعتبار سے اس آیت کے مفہوم کی تعیین میں بھی کچھ اختلاف کیا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ ﴾ کہ اے نبی جس ہستی نے آپ پر یہ قرآن لازم کیا ہے، (اس قرآن کی تبلیغ اور اس کے ابلاغ کا فرض جس نے آپ پر عائد کیا ہے) وہ آپ کو لازماً لوٹائے گا ایک اعلیٰ لوٹنے کی جگہ کی جانب — بعض حضرات نے یہاں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ''معاد'' سے مراد مکہ مکرمہ ہے ان حضرات کے نزدیک اس آیت کا تعلق آپ ﷺ کے سفر ہجرت سے ہے کہ جب آپ ﷺ ہجرت کیلئے مدینہ تشریف لے جا رہے تھے تو مشرکین مکہ کے تعاقب سے بچنے کیلئے کچھ دور تک آپ ﷺ نے عام شاہراہ سے ہٹ کر ایک مشکل راستہ اختیار کیا تھا۔ اس لئے کہ اگر آپ ﷺ عام شاہراہ پر سفر کرتے تو تعاقب کرنے والوں کی نگاہ میں آ جاتے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے وہ پہاڑی راستہ اختیار کیا جو بالکل غیر مستعمل اور غیر مانوس تھا۔ لیکن تقریباً ایک تہائی سفر طے کرنے کے بعد آپ ﷺ پھر اسی شاہراہ پر آ گئے جو مکہ سے مدینہ کی طرف جاتی تھی۔ جب آپ ﷺ وہاں پہنچے تو چونکہ وہاں آپ کیلئے ایک دوراہے کی صورت بن گئی تھی کہ ایک راستہ مکے کو جاتا تھا اور دوسرا مدینے کی جانب، تو دل میں ہوک سی اُٹھی، گویا کہ مکہ نے پھر اپنی طرف کھینچا، بیت اللہ سے اور حرم مکی سے جو محبت محمد رسول اللہ ﷺ کو تھی، اس نے آپ ﷺ کو وقتی طور پر بے چین کیا، اس وقت دلجوئی کیلئے یہ آیت نازل ہوئی: ﴿اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ﴾ کہ اے نبی، آپ ﷺ گھبرایئے نہیں، مکہ اور بیت اللہ سے آپ ﷺ کی یہ جدائی عارضی ہوگی، ہجر کا یہ معاملہ مستقل نہیں رہے گا، یقیناً وہ رب جس نے آپ ﷺ پر قرآن مجید کی تبلیغ اور اس کی دعوت کا فریضہ

(۱) سر کی آنکھوں سے

قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ نا کام ہوں یا بے مراد ہوں ____ یہاں ایک تھوڑی سی تفسیری وضاحت ضروری ہے۔ اکثر مفسرین نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ "اے نبی، یہ قرآن ہم نے آپ پر اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں" لفظ تشقیٰ کا مادہ "ش ق ی" ہے جس سے شقی کا لفظ بنا ہے۔ یہ لفظ "سعید" کے مقابلے میں آتا ہے۔ چنانچہ شقی اس کو کہتے ہیں جو بد بخت ہو، نا کام ہو، بے مراد ہو۔ یعنی وہ شخص جس کی جدو جہد لا حاصل رہے، نتیجہ خیز نہ ہو رہی ہو، وہ شقی ہے جبکہ مشقت کا لفظ "ش ق ق" کے مادے سے بنتا ہے۔ یہ دونوں مادے چونکہ ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں اور اسی قرب کے باعث ایک دوسرے کی جگہ بھی استعمال ہو جاتے ہیں، شائد یہی وجہ ہے کہ اکثر مترجمین نے "لتشقیٰ" کا ترجمہ "مشقت" سے کیا ہے۔ تاہم مجھے ان سے اختلاف ہے۔ یہاں در حقیقت یہ بات کہی جا رہی ہے کہ اے محمد ﷺ یہ قرآن آپ ﷺ پر اس لئے نازل نہیں ہوا کہ آپ ﷺ نا کام ہوں، یہ تو کامیابی کی ضمانت ہے۔ اس قرآن میں جو قوتِ تسخیر اور جو تاثیر مضمر(۱) ہے اس کے پیش نظر یہ ممکن نہیں ہے کہ اس سب کے ہوتے ہوئے آپ نا کامی سے دو چار ہو جائیں۔ آپ ﷺ یقیناً کامیاب ہوں گے اور منزل مراد تک پہنچیں گے۔ اس دنیا میں بھی آپ ﷺ کی جدو جہد کامیابی سے ہم کنار ہوگی اور آخرت میں بھی آپ کے مراتب بلند سے بلند تر ہوں گے۔ شقاوت(۲) آپ کے حصے میں نہیں آسکتی، نہ اس دنیا میں نہ آخرت میں۔ یہ قرآن آپ کی کامیابی کی ضمانت ہے، یہ شقاوت کی ہر اعتبار سے نفی کرنے والا ہے۔ اب آپ غور کیجئے کہ اس میں ہر اُس شخص کیلئے جو قرآن مجید کی کسی بھی درجے میں خدمت کر رہا ہو، کس قدر بشارت ہے اور اس کی دلجوئی کا کتنا کچھ سامان اس میں مضمر ہے۔ ﴿مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى﴾ اس قرآن کی شمشیر کو ہاتھ میں لو، اس کے حقوق کو ادا کرنے کیلئے کمر بستہ ہو جاؤ، تم خود اپنی آنکھوں سے اس کی قوتِ تسخیر کا مشاہدہ کرو گے۔ اس کے اندر جو ہیبت(۳) پنہاں(۴) ہے اور اس میں جو بے پناہ تاثیر

---

(۱) پوشیدہ (۲) نا کامی (۳) رعب و دبدبہ (۴) پوشیدہ

1975ء تک کے عرصے سے ہے جب مرکزی انجمن خدام القرآن قائم ہوئی اور تنظیم اسلامی کے قیام کیلئے میدان ہموار ہو رہا تھا۔ ان میں سے ایک واقعہ دراصل ایک خواب ہے جس کا تذکرہ میں کچھ ڈرتے اور جھجکتے ہوئے کر رہا ہوں کہ کہیں لوگ یہ خیال نہ کریں کہ اب یہ بھی خوابوں کی دنیا میں آ گیا۔ یہ خواب آج سے بیس برس پہلے کا ہے اور اس سے قبل میں نے بعض قریبی احباب کو سنایا بھی ہے۔ میں جس زمانے میں تنظیم اسلامی کے قیام کے بارے میں سوچ بچار کر رہا تھا اور تقریباً اس کے قیام کا فیصلہ کر چکا تھا میں نے یہ عجیب و غریب خواب دیکھا۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں مر گیا ہوں اور میں اپنے جنازے کا منظر بھی ایک چشم دید گواہ (۱) کی حیثیت سے خود کھڑا دیکھ رہا ہوں۔ میں اپنی موت کے تمام مراحل یہاں تک کہ قبر میں اتارے جانے کا بھی خود مشاہدہ کر رہا ہوں۔ یہ ایک عجیب تجربہ تھا کہ میری نگاہوں کے سامنے مجھے قبر میں اتارا جا رہا تھا۔ میں نے اسی وقت بعض بزرگوں سے اس خواب کا تذکرہ کیا تو انہوں نے کہا کہ یہ ایک بہت بڑی بشارت ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ تمہاری زندگی کا ایک دور ختم ہو گیا ہے اور دوسرا دور اب شروع ہوا چاہتا ہے۔ یعنی ایک عزم مصمم (۲) کے ساتھ اقامت دین کی تحریک کے از سر نو آغاز کا جو ارادہ کر لیا ہے یہ درحقیقت اس بات کے مترادف ہے کہ ایک زندگی ختم ہوئی اور ایک بالکل نیا دور اب شروع ہو رہا ہے۔ (واللہ اعلم)

دوسرا واقعہ بھی میری ایک ایسی کیفیت سے متعلق ہے جو بیداری اور نیند کے بین بین تھی۔ واقعے کے سرور اور لذت کا بھی ایک مجھے احساس ہوتا ہے۔ یہ خواب نہیں تھا بلکہ ایک خاص کیفیت تھی جو نیم غنودگی کی حالت میں مجھ پر طاری ہوئی۔ کچھ ''بَیْنَ النَّوْمِ وَالْیُقْظَة'' (۳) کا سا معاملہ تھا۔ نینداور بیداری کے مابین ایک کیفیت میں، میں محسوس کرتا ہوں کہ لگاتار ایک آواز میرے کان میں آ رہی ہے۔ کوئی مسلسل مجھے یہ الفاظ قرآنی سنا رہا ہے کہ: ﴿ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ ﴾ اس کے بعد جب میں

(۱) آنکھوں دیکھا (۲) پختہ ارادہ (۳) نینداور بیداری کے درمیان

عائد کیا ہے وہ آپ کو لوٹا کر لے جائے گا لوٹنے کی جگہ یعنی مکہ مکرمہ!

میرے نزدیک یہ بات اپنی جگہ ایک لطیف خیال کے درجے میں تو صحیح ہے لیکن اگر سورۃ القصص کے زمانہ نزول کو دیکھا جائے اور بعض دیگر قرائن کو پیش نظر رکھا جائے تو اس آیت کی یہ تاویل مطابق واقعہ معلوم نہیں ہوتی۔ سورۃ القصص اپنے مضامین اور اسلوب کے اعتبار سے ان سورتوں میں شمار ہوتی ہے جو حضور اکرم ﷺ کے مکی دور کے درمیانی عرصے میں نازل ہوئیں۔ پھر یہ بات بھی بڑی قابل لحاظ ہے کہ فتح مکہ کے بعد حضور ﷺ نے دوبارہ مکہ میں قیام اختیار نہیں فرمایا، حالانکہ فتح مکہ کے بعد اگر آپ ﷺ چاہتے تو وہیں قیام فرماتے، مدینہ مراجعت اختیار نہ فرماتے۔ اس اعتبار سے بھی وہ تاویل خلاف واقعہ بنتی ہے۔ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ ''معاد'' سے مراد ہے آپ ﷺ کا مقام، آپ ﷺ کے لوٹنے کی جگہ، اعلیٰ انجام۔ جیسے کہ سورۃ بنی اسرائیل میں بشارت کے طور پر فرمایا گیا: ﴿عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾ کہ آپ ﷺ کو تو آپ کا رب مقامِ محمود پر فائز فرمائے گا۔ اس لئے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص قرآن کی دعوت وتبلیغ میں لگا ہوا ہو، لوگوں کو قرآنِ حکیم کی طرف بلانے میں وہ رات دن ایک کر رہا ہو اور پھر وہ ناکام ہو جائے! نہیں، ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ﴿ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ﴾۔ اے نبی، یقیناً آپ ﷺ ایک بہت اعلیٰ انجام سے دوچار ہوں گے، آپ کی جدوجہد کا ایک بہت اعلیٰ نتیجہ نکلے گا جس سے کہ آپ ہم کنار ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں آیات قرآن مجید کے بارے میں بڑی عظیم بشارتوں پر مشتمل ہیں۔

میری زندگی کے دو عجیب واقعات

اس دوسری آیت کے بارے میں غور وفکر کرتے ہوئے مجھے اپنی زندگی کا ایک واقعہ یاد آیا۔ بلکہ چونکہ آج دو چیزوں کا تذکرہ چل رہا ہے یعنی مرکزی انجمن اور تنظیم اسلامی تو اس مناسبت سے دو ہی واقعات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ان دونوں کا تعلق 1972ء سے

کم و بیش اسی طرح کا معاملہ الحمدللہ تنظیم اسلامی کا بھی ہے کہ کوئی بڑا اختلاف اور انتشار [۱] وہاں بھی رونما نہیں ہوا۔ ظاہر بات ہے کہ انسانوں کی جماعت میں کچھ نہ کچھ لوگوں کا اختلاف کرنا یا اکادُکا لوگوں کا جماعت سے علیحدہ ہو جانا بالکل فطری امر ہے، کوئی بھی جماعت اس سے خالی نہیں رہی، یہاں تک کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی جماعتوں میں بھی ایسے لوگ نکل آتے تھے کہ جو ساتھ چھوڑ جاتے تھے، تو تنظیم کے اندر بھی اس طرح کے چند واقعات کا ہونا موجب حیرت یا باعث تشویش نہیں ہونا چاہیے۔ آنحضور ﷺ کی حیات طیبہ میں کئی مواقع ایسے آئے کہ بعض لوگ متزلزل [۲] ہوئے یا ساتھ چھوڑ گئے۔ سیرت کی کتابوں میں یہ بات مذکور ہے کہ واقعہ معراج کے بعد [جب نبی ﷺ نے معراج کے واقعے کی خبر دی کہ میں ایک رات میں بیت المقدس اور وہاں سے آسمانوں کی سیر کر کے آیا ہوں تو] ایسے متعدد مسلمان جو نئے نئے ایمان لائے تھے اور ابھی ایمان میں پختہ نہیں ہوئے تھے اسلام سے پھر گئے تھے [۳] اسی طرح عبیداللہ ابن جحش [۴] کا معاملہ ہے جو اپنی اہلیہ سمیت حبشہ کی جانب ہجرت کر گئے تھے، وہاں جا کر مرتد ہو گئے۔ شوہر کے مرتد ہو جانے کے بعد حضرت اُمِّ حبیبہ رضی اللہ عہنا چونکہ اس کے نکاح میں نہیں رہیں تو پھر حضور ﷺ نے ان کی دلجوئی کیلئے مدینہ منورہ سے نکاح کا پیغام بھجوایا، اس لئے کہ وہ قریش کے ایک بہت بڑے سردار ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) کی صاحبزادی تھیں اور اس حوالے سے ان کا جو مقام و مرتبہ تھا اس کے پیش نظر حضور ﷺ نے مناسب سمجھا کہ ان سے خود نکاح کریں۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ حضور ﷺ کی طرف سے مہر بھی حضرت نجاشیؒ نے ادا کیا تھا۔ اس لئے کہ بوقت نکاح حضور ﷺ مدینہ میں تھے اور حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنھا ابھی حبشہ ہی

---

(۱) بکھرنا (۲) ڈگمگانے والا

(۳) ابن کثیرؒ نے 'بدایۃ' میں لکھا ہے کہ لوگوں کا ایک گروہ اس موقع پر اسلام سے پھر گیا، جبکہ ابن ہشامؒ نے لکھا ہے کہ بہت سارے لوگ جو اسلام لے آئے تھے اسلام سے پھر گئے۔

(۴) حضرت عبداللہ ابن جحشؓ اور ام المومنین سیدہ زینب بنت جحشؓ کا بھائی اور نبی اکرم ﷺ کا یہ پھوپی زاد تھا، حبشہ جا کر عیسائی ہو گیا اور حالتِ ارتدار میں فوت ہوا۔ (الا صابہ فی تمیز الصحابہ)

پوری طرح بیدار ہوا تو ایک عجیب سرور، انبساط اور انشراح کی کیفیت جس کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں، مسلسل کئی روز تک بلکہ کافی عرصے تک مجھ پر طاری رہی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس وقت مجھے تلاش کرنا پڑا تھا کہ یہ آیت قرآنِ حکیم کے کس حصے اور کس سورۃ میں ہے۔اس لئے کہ میرا معاملہ یہ ہے کہ قرآن مجید کا باضابطہ مطالعہ تو اگر بحمد للہ زمانہ طالب علمی سے جاری ہے لیکن زیادہ تفصیلی غور وفکر کا اصل موقع مجھے اپنے سلسلہ وار درسِ قرآنِ حکیم کے ساتھ ملا، بالخصوص تفسیری اختلافات اور مختلف آراء کے مابین اپنی آخری رائے میں نے زیادہ تر اپنے مسلسل درس کے دوران ہی قائم کی ہے۔اور اس وقت جبکہ میں اس دلفریب [(۱)] تجربے سے گزرا میرا درس، قرآنِ حکیم کے اس مقام تک نہیں پہنچا تھا۔اگر تو ایسا ہوتا کہ سورۃ القصص انہیں دنوں میرے زیرِ درس آئی ہوتی اور اس وجہ سے میرے ذہن پر یہ کیفیت طاری ہوتی تو شائد میں اس کی کوئی دوسری تاویل کرتا لیکن چونکہ یہ بات نہیں تھی لہٰذا اسے میں نے اپنے حق میں بہت بڑی بشارت سمجھا۔سرور و انبساط کی کیفیت دیر تک مجھ پر طاری رہی اور ﴿ اِنَّ الَّذِیۡ فَرَضَ عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ ﴾ کی مٹھاس اور حلاوت کا تاثر ایک عرصے تک میرے قلب و ذہن کو فرحت بخشتا رہا۔

ذہن وقلب پر قرآنِ حکیم کا تسلّط اور اس کے مظاہر

قرآنِ حکیم کی قوتِ تسخیر کے ضمن میں، میں ایک اصطلاح استعمال کیا کرتا ہوں کہ قرآن اپنے طالب کو Possess [(۲)] کر لیتا ہے، اس کے ذہن وقلب کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔میرے بعض ساتھی یہی لفظ میرے لئے استعمال کرتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ میرا اپنا احساس یہ ہے کہ میں اگر اس کیفیت سے نکلنا یا نکلنے کی غرض سے ہلنا بھی چاہوں تو ہل نہیں سکتا۔اس لئے کہ اللہ کے فضل وکرم سے میں جس طرح اس کام میں لگا ہوں اس طور سے کام اپنے کسی ادارے اور منصوبے کے تحت نہیں ہوا کرتے۔ایسی کیفیت تو اسی شخص

(۱) پرکشش (۲) قابو میں رکھنا

کی ہوسکتی ہے جو کسی عظیم قوتِ تسخیر کے زیر اثر کسی شکنجے میں آگیا ہو، جکڑا گیا ہو۔ حالانکہ ایسا بھی ہوا کہ کئی کام جو میں نے ارادۃً شروع کیئے ، کوشش کے باوجود میں انہیں مکمل نہیں کر سکا۔ مثلاً ایک موقع پر میں نے اپنے ذاتی حالات لکھنے شروع کیئے لیکن وہ سلسلہ بیچ ہی میں کہیں رک گیا۔ خدمت قرآن کا کام بھی اگر میں محض اپنے ارادے کے تحت کرتا تو اس طور سے ہرگز نہ کر پاتا جیسا کہ اللہ نے مجھ سے کروایا ہے۔ اللہ کی تائید وتوفیق قدم قدم پر میرے شامل حال رہی۔ میں نے جب اپنی میڈیکل پریکٹس بند کی تو کوئی ذریعہ معاش تھا نہ کوئی جائیداد میرے پاس موجود تھی۔ لیکن میں نے توفیق الٰہی سے یہ طے کرلیا تھا کہ اب جسم و جان میں جو بھی توانائی کی رمق [۱] باقی ہے وہ اسی کام میں لگے گی۔ میرے پاس کرشن نگر میں اپنی رہائش کیلئے بس ایک مکان تھا (جسے بعد میں بیچ کر قرآن اکیڈمی کے سامنے مکان بنوایا) [۲] اس کے سوا اور کوئی جائیداد میرے پاس موجود نہیں تھی، لیکن اللہ نے ہمت دی اور میں نے طے کرلیا کہ آئندہ زندگی کا کوئی لمحہ اب تلاش معاش میں صرف نہیں ہوگا، سارا وقت اور صلاحیتیں معاد [۳] کے حصول میں صرف ہوں گی۔ ظاہر بات ہے کہ یہ فیصلہ آسان نہیں تھا۔ میرے پاس اگر وسائل ہوتے، جاگیریں ہوتیں اور ان کے بل پر میں یہ فیصلہ کرتا تو معاملہ مختلف ہوتا۔ الحمدللہ میرے چار بھائی ہیں اور بعض نے مختلف مواقع پر مجھ سے تعاون بھی کیا ہے لیکن اتفاق کی بات ہے کہ اس وقت سب بھائیوں کے ساتھ میرے تعلقات کشیدہ تھے۔ چنانچہ ان میں سے کسی کا تعاون مجھے اس وقت حاصل نہیں تھا۔ [۴] بڑے بھائی کے ساتھ تو بعد میں بھی اس طرح کے حالات نہیں رہے کہ ان کی جانب سے

---

(۱) تھوڑی سی جان

(۲) یہ مکان ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی ہی میں اپنی اولاد میں تقسیم فرمادیا تھا اور بوقت وفات کوئی جائیداد آپ کی ملکیت میں نہیں تھی

(۳) آخرت

(۴) بعد میں حالات مزید بہتر ہوگئے اور ڈاکٹر صاحب کے تمام بھائی ان کے مشن میں شامل ہوگئے تھے۔

تعاون کا معاملہ ہوتا، البتہ چھوٹے بھائی اقتدار احمد نے تعاون کیا، لیکن اس کی نوبت بہت بعد میں آئی۔ انہوں نے بعد میں ایک موقع پر جب مجھے یہ پیشکش کی کہ میں آپ کے کام میں شریک ہونا چاہتا اور آپ کے ساتھ تعاون کرنا چاہتا ہوں تو پہلی بات میں نے ان سے یہ کہی کہ اگر تو صرف بھائی ہونے کے ناطے تعاون کرنا چاہتے ہو تو مجھے قبول نہیں، ہاں اگر تمہیں میرے اس مشن کے ساتھ کوئی دلچسپی ہے اور اس میں تعاون کرنا چاہتے ہو تو سر آنکھوں پر۔ بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ یہ قرآن کی قوتِ تسخیر ہی کا اثر تھا کہ کسی قسم کے معاشی وسائل نہ رکھتے ہوئے بھی اور کسی دنیاوی سہارے کے موجود نہ ہوتے ہوئے بھی میں نے اپنی میڈیکل پریکٹس کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کر لیا اور دعوت رجوع الی القرآن کے کام میں ہمہ وقت مشغول ہو گیا۔ اسے اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ قرآن ہی نے مجھے Possess کر لیا تھا اور میرے ذہن وقلب کو پورے طور اپنی گرفت میں لے لیا تھا!

رسول اور کتاب — ایک حیاتیاتی وحدت

اسی ضمن میں ایک اور بات کی طرف توجہ مبذول[1] کرانا چاہتا ہوں، اگرچہ یہ ایک نازک سا مسئلہ ہے۔ میرے درسِ قرآن سننے والے اکثر حضرات کے علم میں ہے کہ اہم مضامین قرآن مجید میں تھوڑے سے لفظی فرق کے ساتھ کم از کم دو مرتبہ ضرور آتے ہیں۔ ان میں سے ایک اہم مضمون یہ بھی ہے کہ ''رسول'' اور ''کتاب'' دونوں مل کر ایک حیاتیاتی اکائی (Organic Whole) کی مانند ایک وحدت بنتے ہیں۔ اور دنیا میں جو بھی خیر وجود میں آتا ہے اور جو بھی انفرادی یا اجتماعی تبدیلی رونما ہوتی ہے وہ درحقیقت ان دونوں کی مشترک تاثیر کا نتیجہ ہے۔ اب میں قرآن حکیم کے ان دو مقامات کا حوالہ دوں گا جہاں رسول اور کتاب کو ایک وحدت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ البینۃ میں فرمایا گیا ﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ﴾ ''نہیں تھے

---

(۲) توجہ کرنا

وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا مشرکین میں سے اور اہل کتاب میں سے باز آنے والے جب تک کہ ان کے پاس ''بینۃ'' (یعنی واضح دلیل) نہ آ جاتی''۔ اگلی آیت ''بینۃ'' کی وضاحت پر مشتمل ہے ﴿رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ﴾ ''(یعنی) ایک رسول اللہ کی طرف سے۔ پڑھتا ہوا (اللہ کے) پاکیزہ صحیفوں کو جن میں محکم کتابیں ہیں''۔

گویا کہ '' رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ'' اور ''صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ '' یہ دونوں مل کر ''بینۃ'' بنتے ہیں۔ اس کی دوسری مثال سورۃ الطلاق میں ہے، جہاں فرمایا گیا

﴿قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا (١٠) رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾

''ہم نے تمہاری طرف ایک ذکر نازل کر دیا ہے (یعنی) ایک رسول جو تمہیں پڑھ کر سناتا ہے اللہ کی واضح آیات تا کہ وہ ان لوگوں کو جو ایمان اور عمل صالح کا حق ادا کریں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے!''

تو معلوم ہوا کہ ''ذکر'' بھی رسول اور کتاب دونوں کا مرکب ہے اور ''بینۃ'' بھی۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ دو اجزاء پر مشتمل کسی مرکب کے ایک جزو کو اگر آپ زیادہ اہمیت دے دیں گے تو دوسرے جزو کی اہمیت اسی نسبت سے کم ہو جائے گی۔ اگر آپ ایک جزو کو زیادہ Emphasize کر دیں گے تو اس کا منطقی نتیجہ نکلے گا کہ دوسرا جزو پس منظر میں چلا جائے گا اور ان دونوں اجزاء کی جو مشترک تاثیر ہے وہ برقرار نہیں رہے گی۔ یہی حادثہ اس امت کے اندر بھی پیش آیا اور ''رسول'' اور ''کتاب'' پر مشتمل مرکب کے دونوں اجزاء کی اہمیت میں دو اعتبارات سے کمی بیشی کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ ایک انتہا پر منکرین حدیث اور منکرین سنت ہیں جو رسول کی اہمیت کم کر دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اصل شے کتاب ہی ہے اور رسول کی حیثیت گویا محض ڈاک کے ہرکارے کی ہے۔ جیسے چٹھی رسان کا کام چٹھی پہنچانا ہوتا ہے جو اصل اہمیت کی حامل ہوتی ہے، اسی طرح رسول کا کام اللہ کا پیغام پہنچا دینا ہے سو وہ اس نے پہنچا دیا، اب اصل شے یہ قرآن ہے، لہٰذا اصل اہمیت اسی کی ہے۔ یہ

بات بظاہر بڑی دل کو لگتی ہے، لیکن یہ درحقیقت "كَلِمَةُ حَقٍّ اُرِيْدَبِهِ بَاطِلٌ"[۱] والا معاملہ ہے، یعنی بات تو درست ہے، لیکن اس سے جو نتیجہ نکالا جانا مقصود ہے وہ باطل ہے۔ اس لئے کہ اس طرح نبی صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی ذات کی نفی کی جا رہی ہے، ان کی سنت کی حجیت کا انکار کیا جا رہا ہے، اور قرآن کی جو تشریح و توضیح آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے اپنے قول و فعل سے فرمائی ہے اس کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ [حالانکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہدایت اور رہنمائی ہے۔]

اس مسئلہ کا دوسرا پہلو بھی اسی درجے انتہا پسندانہ ہے۔ یہ بات ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب نے اپنی کتاب میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کی ہے کہ یہ جو مرکب ہے رسول اور قرآن کا، عام مسلمانوں نے اس میں سے رسول کی ذات کو اتنی زیادہ اہمیت دی ہے کہ دوسرے جزو یعنی قرآن کی اہمیت کی نفی ہو گئی ہے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ جو بھی تربیتی، اصلاحی اور انقلابی کام ہوا وہ رسول صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی صحبت ہی سے ہوا۔ اس تاثر سے قرآن کی تاثیر کی نفی ہو جاتی ہے۔ یہ بات ذرا باریک بھی ہے اور نازک اور حسّاس بھی، لیکن میں چاہتا ہوں کہ ان حقائق کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اس سے ایک عام مسلمان کو یہ مغالطہ لاحق ہو سکتا ہے کہ شائد اس طرح حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی توہین کی جا رہی ہے، معاذ اللہ ثم معاذ اللہ، لیکن دراصل اس معاملے میں توازن کی ضرورت ہے۔

دیوانہ بکارِ خویش ہوشیار![۲]

عوامی سطح پر ہمارے جو دینی تصورات ہیں ان میں عمل سے فرار کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ نبی صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کو اتنا اونچا کرو، اتنا اونچا کرو، کہ خدا کے برابر بٹھا دو، تو جب خدا کے برابر بٹھا دو گے تو اب اتباع کا سوال ہی نہیں ہے۔ اب تو حمد ہی ہو سکتی ہے، تعریف ہی ہو سکتی ہے، آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی شان میں نعت کہی جا سکتی ہے، لیکن آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کا

---

(۱) سیدنا علیؓ کا فرمان عالی شان جو انہوں نے خوارج کے نظریہ تحکیم کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا "سچی بات جس سے باطل کا ارادہ کیا جائے"۔ (البدایہ و النهایہ)

(۲) دیوانہ اپنے کام میں ہوشیار ہوتا ہے

اتباع تو نہیں ہوسکتا۔ اتباع تو کسی انسان ہی کا ہوسکتا ہے، کسی معبود کا تو نہیں ہوسکتا۔ آپ اللہ کا اتباع نہیں کر سکتے۔ اللہ کی اطاعت کریں گے، اللہ کی عبادت کریں گے، اتباع تو نہیں کر سکتے۔ چنانچہ یہ جو کیا گیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا بنا دیا گیا یہ بھی درحقیقت انسان کی وہی چالاکی ہے کہ اگر ہم نے انہیں انسان کی سطح پر رکھا پھر تو ان کے نقش قدم پر چلنا لازم ہوگا۔ لہٰذا انہیں اٹھاؤ اور اٹھا کر معبودوں کی فہرست میں شامل کر دو۔ اسے کہتے ہیں "دیوانہ بکارِ خویش ہوشیار!" چنانچہ یہ یوں ہی نہیں ہوا ہے کہ بس نعتیں پڑھ لیں تو حضور ﷺ کا حق ادا ہوگیا، باقی کہاں ہم کہاں حضور ﷺ کا مقام! ہم سے آپ ﷺ کا اتباع کیسے ممکن ہے؟ یہ کہا اور فارغ ہوئے۔ ع "عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ!"

قرآن سے بے اعتنائی (۱) کی مختلف وجوہات

اس کے علاوہ متعدد دیگر عوامل ہیں جو قرآن کریم کی اہمیت کو کم کرنے اور اسے مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل رکھنے کا سبب بنے ہیں اور یہ ایک منظّم سازش کے تحت کیا گیا ہے۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم نے اس موضوع پر ایک مقالہ تحریر کیا تھا جو ماہنامہ میثاق میں شائع بھی ہوا تھا، جس میں انہوں نے دلائل سے یہ بات ثابت کی تھی کہ یہ معاملہ ازخود نہیں ہوا بلکہ قرآن کو منظر سے ہٹانے کی اور اس کی تعلیمات کو مسلمانوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کی دانستہ (۲) کوششیں کی گئیں۔ عوام الناس پر ظلم ڈھانے والے اور ان کے حقوق غصب کر کے خود عیاشیاں کرنے والے سلاطین و ملوک اور جاگیر دار و سرمایہ دار نہیں چاہتے تھے کہ قرآن کا انقلابی فکر لوگوں کے سامنے آئے۔ ع "چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب!" انہیں اندازہ تھا کہ اگر یہ کتاب اور اس کی روشن تعلیمات لوگوں کی نگاہوں میں آ گئیں تو ہم ننگے ہو جائیں گے، لوگوں کی آنکھیں کھل جائیں گی اور ہمارے استحصالی (۳) نظام کے بخیے ادھڑ جائیں گے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اسے بند رکھو، اسے صرف

(۱) بے توجہی (۲) جانتے بوجھتے (۳) ظالمانہ

حصول ثواب کا ذریعہ بنا دو، گاہے بگاہے ختم قرآن یا ایصال ثواب کی محفلیں منعقد کر لی جائیں، کچھ کھانے پینے کا سلسلہ ہو جائے، اللہ اللہ اور خیر سلا! تو یہ سب کچھ درحقیقت ایک سازش کے تحت ہوا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ایک معاملہ یہ بھی ہوا کہ جب تاثیر قرآن کی طرف سے توجہ ہٹ گئی اور ایمان کے حصول کا صرف ایک ہی ذریعہ یعنی صحبت محمدی ﷺ ذہنوں میں باقی رہ گیا تو یہ مسئلہ کھڑا ہوا کہ صحبتِ محمدی ﷺ تو ہمیں حاصل نہیں ہے، اب کیا کیا جائے!____ چنانچہ اس کی تلافی کیلئے یہ مراقبے، یہ سارے اَوراد واشغال (۱) اور یہ تپسیائیں اور ریاضتیں، غرضیکہ ایک لمبا چوڑا اطومار (۲) وجود میں لایا گیا۔ یہ سب کچھ محض اس دلیل پر ہوا کہ جو اصل عامل تھا یعنی تاثیر صحبت نبوی ﷺ وہ تو ہمیں حاصل نہیں ہے لہٰذا اسکا کوئی نہ کوئی بدل ہونا چاہیے نتیجہ یہ نکلا کہ یہ اشغال اور ریاضتیں اور یہ چالیس چالیس برس کی بادیہ پیمائی (۳) اور نفس کشی کے یہ مختلف انداز، یہ سب چیزیں ہمارے عوام میں اعلیٰ اقدار شمار ہونے لگیں۔ لوگوں کی دینداری کو اسی پیمانے سے ناپا جانے لگا اور اس چیز نے ہمارے دینی فکر کو اس کے اصل مرکز ومحور یعنی قرآنِ حکیم سے ہٹا دیا۔ اس کا اصل سبب یہی ہے کہ ہم نے رسول اور کتاب کے مرکب میں سے کتاب کی قوتِ تاثیر کو منہا کر دیا۔ یہ ہم سب کیلئے ایک لمحہ فکریہ ہے جس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اصل فیصلہ کُن شے قرآن ہے!

اب آیئے اس سلسلے کی تیسری آیت کی طرف جو سورۃ بنی اسرائیل کے آخری حصے میں وارد ہوئی ہے

﴿وَبِالۡحَقِّ اَنۡزَلۡنٰهُ وَبِالۡحَقِّ نَزَلَ ؕ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيۡرًا ﴾

''(اے نبی ﷺ) ہم نے اس قرآن کو حق کے ساتھ نازل کیا اور یہ حق کے ساتھ ہی

---

(۱) وِرد، وظیفے وغیرہ (۲) پلندہ۔ ڈھیر (۳) صحرا میں پھرنا

نازل ہوا ہے اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر بشیر اور نذیر بنا کر۔‘‘

یہاں بھی آپ دیکھئے کہ قرآنِ حکیم اور نبی اکرم ﷺ دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ ہے بالخصوص قرآنِ حکیم کا ذکر جس زوردار اور فیصلہ کن انداز میں یہاں آیا ہے وہ بہت قابل توجہ ہے۔ قرآنِ حکیم کیلئے ’’بِالْحَقِّ‘‘ کی تکرار اس کی غیر معمولی اہمیت وعظمت کو ظاہر کر رہی ہے۔ اس حوالے سے میں آپ کو اسی نکتے کی جانب متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ اصل فیصلہ کن شے یہ قرآن ہے۔ چنانچہ یہی وہ شے ہے جس کیلئے بقا(۱) اور دوام(۲) ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے بارے میں قرآن حکیم میں ایک مقام پر یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ﴿اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ﴾ کہ ’’اے نبی آپ کا بھی انتقال ہو جائے گا اور یہ لوگ بھی مر جائیں گے‘‘۔ لیکن نوعِ انسانی کا تسلسل تو قیامت تک باقی ہے، ان کی ہدایت و رہنمائی کیلئے اصل شے کونسی ہے؟ یہی قرآن، جس کو بقا اور دوام حاصل ہے۔ اصل قوتِ تسخیر اس قرآن میں ہے۔ یہ قرآن لوگوں کو possess کرے گا۔ ان کے ذہنوں کے اپنی گرفت میں لے کر ان کے باطن میں انقلاب برپا کرے گا۔ جو اس قرآن کی راہنمائی سے فائدہ اٹھائیں ان کیلئے بشارتیں بھی اس قرآن میں موجود ہیں اور جو اس سرچشمہ ہدایت کو رد کردیں ان کے لئے تنبیہہ اور وارننگ ہے کہ ایک دردناک عذاب ان کا منتظر ہے۔

﴿اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ وَیُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَھُمْ اَجْرًا کَبِیْرًا (۹) وَّاَنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ اَعْتَدْنَا لَھُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا (۱۰)﴾ (بنی اسرائیل)

’’بے شک یہ قرآن ہے جو کہ ہدایت دیتا ہے اس راہ کی طرف جو بالکل سیدھی ہے اور بشارت دیتا ہے مومنوں کو وہ جو کہ عمل کرتے ہیں اچھے کہ ان کے لئے ہے بڑا اجر۔ اور وہ لوگ جو کہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے لئے ہم نے تیار کر رکھا ہے دردناک عذاب‘‘۔

---

(۱) باقی رہنا، ختم نہ ہونا (۲) ہمیشہ رہنا

حاصلِ کلام یہ ہے کہ اصل تاثیر اور قوتِ تسخیر اس قرآن میں ہے جس کیلئے الفاظ آئے: ﴿وَبِالۡحَقِّ اَنۡزَلۡنٰهُ وَبِالۡحَقِّ نَزَلَ﴾ اور حضور اکرم ﷺ کے بارے میں فرمایا: ﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيۡرًا﴾ کہ اے نبی بشارت دینا اور انذار کرنا آپ ﷺ کا کام ہے۔ گویا اصل قوت اور طاقت اس قرآن میں ہے جو اللہ کا کلام ہے!

در بغل داری کتاب زندۂ [1]

قرآن حکیم کی قوتِ تسخیر کے حوالے سے ایک آخری بات مجھے مزید عرض کرنی ہے۔ دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو معجزات عطا ہوئے ان میں اہم ترین عصا کا معجزہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام جب اسے زمین پر ڈالتے تھے تو وہ ایک بڑے سانپ یا اژدھے کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ قرآنِ حکیم میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ فرعون نے جب حضرت موسی علیہ السلام کے مقابلے کے لئے جادوگروں کو جمع کیا تو انہوں نے بھی تقریباً وہی کچھ کر کے دکھا دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا سانپ بن جاتا تھا۔ جادوگروں نے جب اپنی رسیاں چھڑیاں پھینکیں تو وہ بھی سانپ بن کی جنبش کرنے لگیں۔ اُس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وقتی طور پر خوف طاری ہو گیا اور تھوڑی دیر کیلئے یہ حقیقت ان کے ذہن سے محو ہو گئی کہ ان کی اپنی بغل میں اللہ عطا کردہ ایک عظیم معجزہ یعنی عصا موجود تھا۔ اسکی قوتِ تسخیر کا خیال ان کے ذہن سے نکل گیا۔ تاہم یہ ایک عارضی سی کیفیت تھی جو جادوگروں کے باندھے ہوئے سحر کے زیر اثر ان پر طاری ہوئی۔

اس واقعے سے میرا ذہن اس بات کی طرف منتقل ہوا کہ ہمارے آج کل کے جدید دانشور اور منکرین حدیث بڑے شد و مد کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ نبی پر جادو کا اثر نہیں ہوتا، حالانکہ بخاری شریف میں حضور اکرم ﷺ پر جادو کی روایت موجود ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ یہ بات عصمت انبیاء کے منافی ہے کہ نبی پر جادو کا کچھ اثر واقع ہوا، لہٰذا یہ حدیث صحیح

---

(۱) تُو بغل میں زندہ کتاب رکھتا ہے

نہیں ہوسکتی۔اس طرح کے بے بنیاد استدلال قائم کرکے وہ صحیح بخاری ہی نہیں پورے ذخیرہ احادیث پر سے عوام الناس کا اعتماد ختم کرنے کے درپے ہیں۔ یہ وہ ہتھکنڈے ہیں جو آج کل منکرین حدیث کی جانب سے استعمال ہورہے ہیں۔ میں اسکا جواب قرآن سے دیتا ہوں۔قرآن حکیم سے ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جادو کا اثر ہوا۔ دوسرے لوگوں کی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی وہ چھڑیاں اور رسیاں دوڑتے ہوئے سانپوں ہی کی صورت میں نظر آئیں۔ یہی تو جادو کا اثر تھا، اسی کا نام نظر بندی ہے۔سورۃ طٰہٰ میں صراحت موجود ہے ﴿ فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی ﴾ کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں خوف محسوس کیا۔آپ اس صورت حال کو اپنے اوپر طاری کرکے سوچئے۔ دل میں خیال آیا ہوگا کہ یہی تو میرے پاس اصل ہتھیار تھا، ان جادوگروں نے بھی وہی کچھ کرکے دکھا دیا جو میں عصا کے حوالے سے پیش کرتا ہوں۔اب تو لوگوں کے سامنے زیادہ سے زیادہ یہ بات آئے کہ یہ بڑا جادوگر ہے اور وہ چھوٹے جادوگر۔ چنانچہ ان پر خوف طاری ہوا۔ ﴿ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰی ﴾ ہم نے فرمایا اے موسیٰ، مت ڈرو، یقیناً تم ہی سربلند ہوگے، کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔ ﴿ وَاَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ﴾ اور ذرا زمین پر ڈالو تو سہی اس چیز کو جو تمہارے داہنے ہاتھ میں ہے، یہ عصا ان سب کو نگل جائے گا اور یہ سوانگ[1] جو انہوں نے رچایا ہے اس کی قلعی کھل جائے گی۔ یہی اسلوب اقبال نے بھی مستعار لیا ہے اور اپنے اس شعر میں یہی پیغام امت کو پہنچایا ہے۔

اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندہ![2]

کہ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بغل میں عصا موجود تھا لیکن جادوگروں کی رسیوں اور

(۱) بہروپ

(۲) اے مسلمان! تو زمین پر شبنم کی طرح گرا ہوا ہے لیکن تجھے شعور نہیں کہ تیری بغل میں زندہ کتاب (قرآن حکیم) موجود ہے۔

چھڑیوں سے وقتی طور پر جو ایک منظر سامنے آیا اس سے ان پر خوف طاری ہو گیا، آج بعینہ وہی حال امت مسلمہ کا ہے کہ اس کے پاس قرآن مجید کی شکل میں سب سے بڑا ''ایٹم بم'' موجود ہے، لیکن انہیں شعور ہی نہیں کہ اللہ کا کتنا عظیم معجزہ ان کی بغل میں موجود ہے، جس کی قوتِ تسخیر کے سامنے کوئی شے نہیں ٹھہر سکتی! حقیقت یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان ہمارے تمام مسائل کا حل اگر ایک شے میں ہے تو وہ اللہ کی کتاب ہے۔ آپ حضرات یہ حدیث متعدد مرتبہ سن چکے ہوں گے جس کے راوی حضرت عمرؓ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَاالْکِتٰبِ اَقْوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ اٰخَرِیْنَ)) (صحیح مسلم) کہ اللہ تعالیٰ اسی کتاب کی بدولت بہت سی اقوام کو بلندی عطا کرے اور اس کے ترک کرنے کی پاداش میں بہت سی قوموں کو زوال سے دوچار کرے گا۔ یہ وہی بات ہے جو سورۃ بنی اسرائیل میں ان الفاظ میں وارد ہوئی: ﴿وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ﴾ اور سورۃ الطارق میں بایں الفاظ[1] بیان ہوئی: ﴿ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ﴾ کہ یہ تو قول فیصل ہے، فیصلہ کن کلام ہے، کوئی شاعرانہ تک بندی نہیں ہے۔ یہ ہے درحقیقت قرآن کی تاثیر اور قوتِ تسخیر ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم قرآن حکیم پر اعتماد نہیں کرتے۔ قرآن مجید کی عظمت سے اگر ہم حقیقتاً واقف ہو جائیں اور اس کے اندر جو قوتِ تسخیر پنہاں ہے اس کا ہمیں کسی درجے میں اندازہ ہو جائے تو ہمارے تمام مسائل حل ہو جائیں۔

جہاد بالقرآن —— وقت کی اہم ضرورت

اسی حوالے سے ذہن منتقل ہوا کہ آج سے سات آٹھ سال قبل میں نے جہاد بالقرآن کے موضوع پر دو تقریریں کی تھیں۔ سورۃ الفرقان میں نبی اکرم ﷺ کو جہاد بالقرآن کا حکم بایں الفاظ میں دیا گیا ہے۔ ﴿ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ کہ اے نبی ﷺ ان کافروں کی باتوں پر آپ توجہ نہ دیجئے، ان کی پیروی کا خیال دل میں نہ

---

(۱) ان الفاظ میں

لائیے اوران کے ساتھ جہاد کرتے رہیے ۔ اس قرآن کے ذریعے سے بڑا جہاد! اپنی توانائیاں اوراپنی قوتیں اس قرآن کے افشاءاوراس کے ابلاغ پر لگا دیجئے، کھپا دیجئے، لگے رہیےاسی کام میں ۔یہی درحقیقت آپ کی طاقت کااصل راز ہے۔،آپ کی کامیابی کی اصل ضمانت یہی قرآن مجید ہے۔﴿ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ ﴾

جہاد بالقرآن ہی کے موضوع پر بعد میں، میں نے ایک اورتقریر کی تھی اوراس میں جہاد بالقرآن کے پانچ محاذ معین کئے تھے۔اگرآپ اپنے ماحول کا جائزہ لیں تو آپ دیکھیں گے کہ ہمارے معاشرے میں ایک محاذ تو جدید ملحدانہ [1] نظریات کا ہے۔اس زہر کا توڑ اسی قرآن مجید میں ہے۔ پھر ہمارے عوام کی ایک عظیم اکثریت مشرکانہ اوہام اورعقائد کا شکار ہے۔اس کا توڑ بھی یہی قرآن ہے بلکہ اس گمراہی کا توڑ تو اس میں زیادہ نمایاں اورجلی انداز میں ہے۔اس لئے کہ جب قرآن نازل ہوا تو وہاں یہی گمراہی سب سے زیادہ تھی ،لہٰذا اس کی نفی اور تردید بھی سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ ہوئی۔ باقی جہاں تک جدید باطل نظریات اور ملحدانہ افکار وخیالات کا تعلق ہے تو ظاہر بات ہے کہ اس کے توڑ کے لئے تو قرآنِ حکیم میں غوطہ زنی کرنی پڑے گی، کچھ گہرائی میں اتر کر حکمت ومعرفت کے موتی اور ہیرے نکالنے ہوں گے۔لیکن قدیم جاہلیت کا توڑ تو اس میں گویا بالکل سطح پر (On the Surface) موجود ہے۔ ہمارا تیسرا سب سے بڑا مسئلہ تفرقہ اورفرقہ واریت ہے۔اس تفرقے کا ایک ہی علاج ہے:﴿ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ﴾ (آل عمران: 103) ’’اور مضبوطی سے تھام لو اللہ کی رسّی کو سب مل کر اور تفرقہ مت ڈالو‘‘۔ جتنا اس قرآن کے قریب آئیں گے اتنی ہی باہمی ہم آہنگی ہوگی۔ یوں بھی سوچا جائے کہ انسان چونکہ حیوانِ ناطق ہے اور عقل رکھنے والا حیوان ہے، لہٰذا انسانوں کے درمیان ذہنی ہم آہنگی اگر ہوگی تو باہم اتحاد بھی ہوگا ورنہ آپ اتحاد کے موضوع پر وعظ کہتے رہیے، اتحاد کے لیکچر دیتے رہیے اس پر مضامین لکھ کر چھاپتے رہیے، اتحادنہیں ہوسکتا۔ باہم

---

(۱) لادینی نظریات

ذہنی اور فکری ہم آہنگی اگر پیدا ہوگی تو بامعنی اور پائیدار اتحاد جنم لے گا۔ اور اس کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ اللہ کی رسی یعنی قرآن کو مل جل کر مضبوطی سے تھام لیا جائے۔

ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست
اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست (۱)

ہمارا ایک مرض اور بھی ہے، اور وہ ہے بے یقینی۔ یعنی باطل نظریات کا بھی اگرچہ ذہن پر تسلط نہیں ہے، کوئی گمراہ کن اوہام بھی نہیں ہیں، لیکن جسے یقین کہتے ہیں وہ شے موجود نہیں ہے، اور یقین کی پونجی اگر پاس نہ ہو تو عمل کا کیا سوال؟____ قرآنِ حکیم میں کچھ لوگوں کا قول نقل ہوا ہے: ﴿اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ﴾ کہ اے محمد ﷺ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں لگتا ہے کہ ٹھیک کہہ رہے ہیں، بات وزنی معلوم ہوتی ہے لیکن یقین نہیں آتا، اس پر دل نہیں ٹھکتا! اور ظاہر بات ہے کہ عمل تو یقین کے تابع ہے، یقین بدلے گا تو عمل بدلے گا۔ بقول اقبالؔ

یقیں پیدا کر اے ناداں، یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

جان لیجئے کہ اس یقین کا سرچشمہ اور منبع بھی یہی قرآن ہے اور یہی ہے کہ جو ''شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ'' (۲) ہے۔ یعنی باطنی اور روحانی بیماریوں کا موثر اور تیر بہدف علاج یہی قرآنِ حکیم ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جن پر میں نے ''جہاد بالقرآن کے پانچ محاذ'' کے موضوع پر اپنے خطابات میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ میری یہ دونوں تقریریں اب کتابی صورت میں شائع ہوتی ہیں (۳)۔

---

(۱) ہم تو سرتاپا خاک ہی خاک ہیں ہمارا قلب زندہ اور ہماری روح تابندہ تو اصل میں قرآن ہی ہے۔ لہٰذا اے مسلمان! تو قرآن کو مضبوطی سے تھام لے کہ (حبل اللہ) اللہ کی رسی یہی ہے۔

(۲) سینوں کے امراض کیلئے شفاء، یونس: 157

(۳) جہاد بالقرآن اور اس کے پانچ محاذ

نبی اکرم ﷺ نے فریضۂ رسالت کی ادائیگی اور غلبہ و اقامت دین کے مشن کیلئے جو بے مثال جدوجہد کی اسے دو عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ آپ ﷺ نے مسلسل بارہ برس مکے میں قرآن کے ساتھ جہاد کیا اور پھر دس برس مدینے میں یہ جہاد تلوار کے ساتھ ہوا! یہ دو ہی تو جہاد ہیں جو محمد عربی ﷺ کے جہادِ زندگانی میں سب سے نمایاں ہیں۔ ایک کا عنوان جہاد بالقرآن ہے جو بارہ یا تیرہ برس مکے میں ہوا کہ جس میں شمشیر نبی اکرم ﷺ اور مسلمانوں کے ہاتھ میں نظر نہیں آتی اور دوسرا جہاد بالسیف ہے جس کا آغاز ہجرت کے بعد ہوا اور جو آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے آخری سانس تک جاری رہا۔ یہ بات نوٹ کیجئے کہ جہاد بالسیف کیلئے جو طاقت درکار ہوتی ہے، فدائین کی جو جمعیت اور سرفروشوں کو جو جماعت درکار ہوتی ہے، وہ کہاں سے آئے گی؟ — یہ سرفروش جہاد بالقرآن کے نتیجے میں فراہم ہونگے۔ قرآنِ حکیم اگر انہیں مسخر کر لے اور ان کے اندر سرایت کر جائے تو یہی لوگ ہیں جو باطل کے مقابلے میں بنیان مرصوص (۱) ثابت ہوں گے اور باطل نظام کو الٹ کر رکھ دیں گے۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شوَد
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شوَد (۲)

اس اعتبار سے جہاد بالقرآن گویا جہاد بالسیف سے اہم تر ہے۔ اس لئے کہ پہلی منزل اہم تر ہوتی ہے۔ پہلی منزل موجود ہوگی تو اس کے اوپر دوسری منزل کی تعمیر ممکن ہوگی جہاد بالقرآن ہوگا تو جہاد بالسیف کا امکان ہوگا!

---

(۱) سیسہ پلائی دیوار
(۲) (یہ قرآن) جب کسی کے باطن میں سرایت کر جاتا ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے، اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اس کیلئے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آجاتی ہے۔

بھارت کے خلاف ہمارا اصل ہتھیار ـــــ شمشیرِ قرآنی

اس ضمن میں ایک بات میں مزید کہنا چاہتا ہوں، میں نے داخلی طور پر تو پانچ محاذ گنوا دیئے جن کے لئے قرآن ہمارا سب سے بڑا اور موثر ہتھیار رہے، خارجی اعتبار سے ہمارے لئے اہم ترین مسئلہ بھارت کا ہے۔ آج سے دو یا تین سال قبل میں نے مرکزی انجمن کے سالانہ اجلاس عام ہی میں اس ایشو پر ایک تقریر کی تھی، میں نے عرض کیا تھا کہ بھارت کے مقابلے میں بھی ہمارا سب سے بڑا ہتھیار قرآنِ حکیم ہے۔ اس لئے کہ فکر اور نظریئے کے میدان میں بھارت کے پاس کچھ نہیں ہے۔ ہندو قوم کے پاس اپنا کوئی جاندار نظریہ نہیں ہے، نہ مذہب کے میدان میں اور نہ فلسفے کے میدان میں۔ مذہب کے نام پر ان کے ہاں جو ایک تحریک چل رہی ہے وہ محض بعض سیاسی مقاصد کیلئے چلائی گئی ہے، ورنہ دراصل ہندوازم صرف ایک کلچر ہے، کچھ رسومات ہیں اور کچھ ایسی سماجی تقریبات ہیں جن کے حوالے سے وہ کچھ جشن منا لیتے ہیں، باقی کوئی شے ان کے پاس نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پورے طور پر مغرب کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، فلسفہ وفکر بھی انہوں نے مغرب سے مستعار لیا ہے اور ان کے تہذیب وتمدن پر بھی مغرب کا رنگ غالب ہے۔ چنانچہ ان کا نظامِ حکومت ہو یا تصورِ قانون سارے کا سارا اور جوں کا توں مغرب سے درآمد شدہ ہے۔ یہی سبب تھا کہ متحدہ ہندوستان میں دنیاوی اعتبار سے ہندو ہم سے آگے نکل گیا تھا۔ اسلئے کہ اس کے باوجود کہ مسلمانوں میں بہت سے لوگ مغربی رو تہذیب کے خلاف ایک ردعمل پروان چڑھا اور انہوں نے اس تہذیب کو ذہناً اور عملاً قبول نہیں کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری قوتیں منقسم ہو گئیں۔ علماء دیوبند ڈٹ گئے کہ نہ انگریزی پڑھیں گے نہ انگریزی تہذیب اختیار کریں گے۔ انہوں نے انگریز، انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب سب سے لاتعلقی اور بیزاری کا اعلان کیا۔ گویا مکمل بائیکاٹ کی صورت بن گئی۔ ہندو کیلئے ظاہر بات ہے کہ ایسی کوئی رکاوٹ موجود نہیں تھی۔ اس کا کوئی تمدن تھا نہ تہذیب، نہ ان کے ہاں اپنے کوئی نظریات

تھے نہ افکار، لہٰذا انہوں نے بلا جھجک اور بلا توقف انگریز کی تہذیب، اس کے تمدن، اس کی زبان، ہر شے کو اختیار کر لیا۔ انہیں اس کا اضافی فائدہ یہ ہوا کہ انہیں انگریز کا قرب بھی حاصل ہو گیا۔ ظاہر بات ہے کہ حکمرانوں کا قرب حاصل کرنے کا اس سے بہتر راستہ کوئی نہیں کہ آپ انہی کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگ دیں۔ جبکہ مسلمانوں کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔

بہر حال یہ تو ایک ماضی کا معاملہ تھا، مجھے اصلاً مستقبل کے حوالے سے بات کرنی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ بحیثیت ملک پاکستان کا اصل مقابلہ بھارت کے ساتھ ہے، بھارت وہ ملک ہے جس کے ساتھ ہماری پیدائشی دشمنی ہے۔ مادی قوت کے اعتبار سے اگرچہ ہم بھارت سے بہت پیچھے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے خلاف نظریاتی طور پر ہماری بہت بڑی قوت موجود ہے۔ اس فکر کو اگر ہم پھیلا سکیں تو اس شمشیر قرآن سے ہم دشمن کو گھائل کر سکتے ہیں۔ اور یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑے فضل و کرم کی ہے کہ ہمارے اور ہندوستانی قوم کے درمیان زبان کی کوئی لمبی چوڑی خلیج حائل نہیں ہے۔ حالانکہ اگر ہم مغرب کی طرف چلے جائیں، ایران یا عرب ممالک میں جا کر اپنی بات پہنچانا چاہیں تو وہاں اردو زبان ابلاغ کا ذریعہ نہیں بنتی۔ لیکن یہ جو ایک بہت بڑا ملک ہے، پوری نوع انسانی کی 1/5 تعداد جہاں آباد ہے، آج بھی اس ملک کے کونے کونے میں اردو زبان سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ چاہے وہ تامل ناڈو کا علاقہ ہو، خواہ ملیالم کا علاقہ ہو اور خواہ بنگال کا خطہ ہو، ہر جگہ اردو سمجھنے والے موجود ہیں۔ اس بات کو میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہی مظاہر میں سے شمار کرتا ہوں جن کو بناء پر میں سمجھتا ہوں کہ اس برِّعظیم پاک و ہند سے اللہ تعالیٰ کو کوئی خاص خدمت لینی ہے، اور مستقبل کی جو بھی اس کی منصوبہ بندی ہے اس میں کوئی نہ کوئی اہم مقام اور اہم رول اس خطے کا ضرور ہے کہ یہیں شاہ ولی اللہ دہلویؒ پیدا ہوئے، اسی خطے سے اس عظیم قرآنی تحریک کا آغاز ہوا جو تین سو برس پرانی تحریک ہے، کوئی آج کی تحریک نہیں ہے۔ اس کا آغاز تو شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فارسی ترجمے اور ان کی ''الفوز الکبیر'' سے ہوا تھا۔ پھر ان

کے چاروں بیٹوں (رحمۃ اللہ علیہم) کے تراجم قرآن اور تفسیروں سے یہ تحریک آگے بڑھی۔ اس وقت سے جو سلسلہ شروع ہوا تو درحقیقت یہی ہے کہ جو بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچا کہ آج ہم بھی اس تحریک میں بقدرِ ہمت اپنا حصہ ادا کر رہے ہیں اور خدمت قرآنی کے اس کام میں اپنی بساط[1] کے مطابق شریک عمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسے شرف قبول فرمائے۔ بہر کیف اردو زبان کو ذریعہ ابلاغ بنا کر اگر قرآن کے فکر و فلسفہ اور قرآن کی حکمت و ہدایت کو ہندوستان میں بسنے والے لوگوں میں بھرپور طریقے سے پیش کیا جا سکے تو اس سے بڑا اور کوئی ہتھیار نہیں! شاہ ولی اللہؒ ہی نے ''تفہیماتِ الٰہیہ'' میں یہ بات لکھی ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ ہندوستان کے اونچی ذات کے ہندوؤں کی اکثریت اسلام قبول کر لے گی۔ یہ ایک پیشین گوئی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے حق میں تمام شواہد موجود ہیں۔

بدقسمتی سے ہندوستان کے ساتھ آج تک ہماری قومی جنگ جس نوعیت کی رہی ہے اس میں مادی نقطہ نظر اور جذباتیت پسندی کو زیادہ دخل رہا ہے، چنانچہ اس کے نتیجے ہم خود ہندو قوم اور قرآن کے درمیان اپنے وجود سے ایک آڑ اور حجاب بن گئے ہیں۔ وہ قرآن مجید کی ہدایت کی طرف رجوع کیسے کریں جبکہ وہ ایک دشمن قوم کی کتاب ہے۔ یہ وہ حجاب اور Barrier ہے جس کی وجہ سے نوع انسانی کی ایک بہت بڑی تعداد قرآن مجید سے محجوب ہے۔ اگر ہم کسی طریقے سے اس Barrier کو ختم کر کے قرآن کے پیغام اور اس میں مضمر ہدایت کو بیک وقت، اعلیٰ ترین علمی سطح پر بھی اور عوام الناس کی سطح پر بھی پیش کر سکیں تو واقعہ یہ ہے کہ ہماری سب سے بڑی قوتِ تسخیر یہی ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اس کی طرف سے ہم غافل ہیں اور مغربی افکار و نظریات اور تہذیب و تمدن کی ظاہری چمک دمک نے خود ہماری آنکھوں کو خیرہ کر رکھا ہے۔ جیسے عارضی طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام جادوگروں کی ڈالی ہوئی ان رسیوں اور چھڑیوں کو سانپوں کی شکل میں دیکھ کر ڈر گئے تھے، آج ہم بھی اہل مغرب کی ڈالی ہوئی ان رسیوں اور چھڑیوں کے بنے ہوئے سانپوں سے مرعوب اور خوف زدہ ہیں۔ یہ

(۱) طاقت

رسیاں چاہے افکار اور نظریات کی ہوں، خواہ تہذیت وتمدن کی ہوں اور خواہ سائنسی ترقی کے روپ میں ہمیں مرعوب کر رہی ہوں، سب انسانی ذہن کی تراشیدہ ہیں۔ اس سے کہیں بڑھ کر وہ قوتِ تسخیر ہے جو قرآن حکیم کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ الحمدللہ ہماری یہ تحریک قرآن جو انجمن خدام القرآن کے نام سے برسرِ عمل ہے، اسی قرآن کے پیغام اور اس کی ہدایت کو عام کرنے کیلئے کوشاں ہے۔ اور فی الاصل، جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا، میری یہ تقریر اللہ کی جناب میں ہدیہ تشکر پیش کرنے کیلئے ہے کہ اس انجمن کو قائم ہوئے بیس برس ہو گئے۔ اس دوران جو کام اب تک ہم سے ہوا اسی کے فضل سے ہوا۔ تو جہاں ہمیں اپنے قلب کی گہرائیوں سے اللہ کا شکر بجالانا چاہیے وہاں ہمیں اس کام کی اہمیت کا صحیح صحیح شعور بھی ہونا چاہیے اور اس حوالے سے قرآن مجید کی قوتِ تسخیر پر اعتماد اور توکل میں مزید پختگی آنی چاہیے کہ اصل شے یہ ہے، اس پر محنت کرو، اسے عام کرنے اور پھیلانے کیلئے جدوجہد کرو﴿ وَفِي ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴾(المطففین:26) ''اس کیلئے سبقت لے جانے کی کوشش کریں سبقت لے جانے والے''۔ چاہیے کہ اربابِ ہمت وعزیمت اپنی عزیمتوں کے اظہار کیلئے اس میدان کا انتخاب کریں اور اپنی سعی و جہد کا مرکز و محور قرآنِ حکیم کو بنائیں۔

چند عملی نکات

اب میں وہ چند عملی باتیں آپ سے عرض کروں گا جو میں نے انجمن کے سالانہ اجلاس میں بھی کہی تھیں۔ پہلی بات یہ کہ اس انجمن میں آپ کی شمولیت (Participation) عملاً بڑھنی چاہیے۔ بطورِ خاص آپ سے یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جیسا کہ میں نے دورانِ تقریر بھی عرض کیا، بہرحال اب میں تو آخرت کی دہلیز پر کھڑا ہوں۔ بحمدللہ بیس برس میں نے اس ادارے کو چلایا ہے اور یہ سب کچھ اُسی کے فضل و کرم سے ہوا۔ اس میں عافیت یہ بھی رہی ہے کہ صدر مؤسس ہونے کے ناطے اس ادارے میں مجھے خصوصی اختیارات

حاصل تھے، میرے پاس ویٹو کا حق تھا اور اب بھی ہے۔ لہٰذا کسی بڑے ہنگامے کے کھڑا ہونے یا بحران کے پیدا ہونے کا یہاں کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ لیکن آئندہ اس کا امکان یقیناً ہوگا، اس لئے کہ میرے بعد کسی صدر کو ویٹو پاور حاصل نہیں ہوگی۔ آئندہ کا نظام طے شدہ دستور کے مطابق چلے گا۔ لہٰذا جن حضرات کو بھی اس کام اور اس قرآنی فکر سے دلچسپی ہے اور جو چاہتے ہیں کہ پچھلے بیس برس میں جو کام ہوا ہے وہ کہیں غلط رُخ پر نہ پڑ جائے یا غلط ہاتھوں میں نہ چلا جائے تو انہیں چاہیے کہ اس انجمن کے ساتھ اپنی وابستگی کو فعال بنائیں۔ اپنے اوقات کا کچھ حصہ اس کیلئے ضرور نکالیں اور یہ خیال ذہن میں نہ لائیں کہ یہ کام تو خود بخود چل رہا ہے، ہماری اس میں کیا ضرورت ہے! جن حضرات کے ذہنوں میں بھی ایسا کوئی خیال تھا انہیں اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دینا چاہیے اور اس کام سے دلچسپی رکھنے والے تمام حضرات کو چاہیے کہ اس کام میں عملی شمولیت کو بڑھانے کی طرف توجہ دیں۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس کام کے لئے قبول فرمائے!

دوسری بات — اور یہ بات مجھے خاص طور پر انجمن کے پرانے وابستگان سے کہنی ہے کہ ان میں وہ بھی ہیں کہ جو میرے دروسِ قرآن اور تقاریر کی مجالس میں پہلی صفوں میں بیٹھے نظر آتے ہیں لیکن مجال ہے کہ انہوں نے تنظیم اسلامی یا تحریک خلافت کی جانب ایک قدم بھی آگے بڑھایا ہو۔ ان حضرات کو اپنے طرزِ عمل پر نظر ثانی کرنی چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ یہ سارا کام کیا محض کسی مشغلے کے طور پر ہو رہا ہے؟ یہ ہرگز کوئی Cult[(۱)] نہیں ہے! یہ کوئی ہندوؤں کے طریقے پر رشی منی کا کوئی سلسلہ نہیں ہے!! یہ ایک اہم دینی کام ہے، یہ ایک انقلابی مشن ہے اور کوئی بھی ایسا کام کہ جس میں انقلاب کے بیج موجود ہوں لیکن وہ پھیلیں پھولیں نہیں، برگ و بار نہ لائیں تو وہ کام اپنی معنویت کھو دے گا۔ محض پڑھنے پڑھانے تک خود کو محدود رکھنا اور اس کے عملی تقاضوں سے گریز کرنا دینی اعتبار نفع بخش نہیں ہے۔ الحمد للہ کہ میری زندگی میں صرف پڑھنا پڑھانا نہیں رہا بلکہ میں نے اللہ کے فضل و کرم سے آگے

(۱) محض مذہبی پوجا پاٹ

قدم بڑھایا اوراسی اعتبار سے اس کام میں معنویت برقرار رہی۔تو جولوگ بھی اس کام میں ذہنی دلچسپی رکھتے ہیں انہیں چاہیے کہ آگے بڑھیں، تنظیم اورتحریک کی طرف عملاً پیش قدمی کریں اوراس میں شمولیت اختیار کریں۔

تیسری بات جو میں خاص طور پر نوٹ کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ دعوت رجوع الی القرآن کے ایک سالہ کورس کی میرے نزدیک خصوصی اہمیت ہے۔میں اراکینِ انجمن اورخصوصی طور پر اس آبادی کے لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ انہیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس کورس میں شمولیت کرنی چاہیے۔ ہمارا یہ کورس چار چار ماہ کے دوسمسٹرز پر مشتمل ہے۔چنانچہ جوحضرات پورا سال فارغ نہ کر سکتے ہوں وہ چار مہینے تو ضرور نکال لیں اور پہلا سمسٹر کرلیں، دوسرا سمسٹر اگر کچھ وقفے کے بعد بھی ہو سکے تو کوئی بات نہیں۔لیکن بہر حال اسکے لئے ایک سال کا ارادہ ضرور کرلیں۔ہم میں سے ہر شخص کو، خاص طور پر پڑھے لکھے لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ ہمیں اللہ کے حضور اس بات کی جوابدہی کرنا ہوگی کہ ہم نے سب کچھ پڑھا،لیکن اتنی عربی نہ سیکھی کہ اس کے کلام کو براہ راست سمجھ سکتے۔اس کوتاہی کا ہمارے پاس کیا جواز ہے؟ ہم نے انگریزی اتنی پڑھ لی کہ انگریزوں کو پڑھا سکتے ہیں، مختلف فنون حاصل کر لیے،سائنسی علوم میں بڑی سے بڑی ڈگریاں حاصل کرلیں،لیکن نہیں پڑھی تو عربی نہیں پڑھی۔ ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کے اس سوال کا کیا جواب ہوگا کہ تم نے میرے کلام کی کیا قدر کی؟ خود میری کیا قدر کی؟؟ قرآن حکیم میں مشرکین کے بارے میں فرمایا گیا ہے:﴿ مَاقَدَرُوْ اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ ﴾(الحج :74) کہ انہوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جیسی کہ اس کی قدر کرنی چاہیے۔ہمیں اس بات کی فکر کرنی چاہیے کہ ہم کہیں ان الفاظ کا مصداق نہ ٹھہریں۔چنانچہ اس ضمن میں جو بھی کمی رہ گئی ہے ہمیں اس کی تلافی کرنی چاہیے۔ اگر کسی کے والدین کی کوتاہی ہو اور وہ اللہ کے ہاں پہنچ گئے ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ ان کی تلافی وہ اب بھی کرسکتا ہے۔آپ اب اس کام کیلئے وقت فارغ کریں اوراللہ کے حضور یہ دعا کریں کہ اے اللہ، میں اپنے والدین کی کوتاہی کی اب تلافی کر رہا ہوں، میرے والدین

کو بخش دے، انہیں معاف فرما دے۔ اے اللہ، میں اب اس کیلئے وقت نکال رہا ہوں، میری اس جِدّ وجُہد کو اور میرے اس وقت کو جو میں صرف کر رہا ہوں میرے والدین کی طرف سے کفارے کے طور پر قبول کر لے! میں بتکرار واعادہ توجہ دلا رہا ہوں کہ یہ کام کرنے کا ہے، اس میں دیر نہ کیجئے، تاخیر نہ کیجئے!!!

اقول قولی ھذا و استغفر اللہ لی ولکم و لسائر المسلمین والمسلمات